

اس معاشرے اور ملک پر رحم کیجیے

پاکستان میں ایسی قوتیں علی الاعلان کام کر رہی ہیں جو اس معاشرے اور ملک کو اس کی نظریاتی بنیادوں سے ہٹا کر یہاں مغربی فکر و تہذیب اور اس کی اقدار کو فروغ دینے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ اسلام اور پاکستان کے دشمن ایسا اس لیے چاہتے ہیں تاکہ یہ ملک خدا نخواستہ کمزور ہو جائے اور لوٹ جائے..... اور جو مقامی عناصر اس کا تخریب میں شریک اور مصروف ہیں وہ یا تو مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر ہیں اور اسے ہی دنیا میں کامیابی اور طاقت کے حصول کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں یا پھر حب جاہ و مال اور دنیاوی مفادات کی خاطر دشمنوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

ہم گول مول بات کرنے کی بجائے اور لگی لپٹی رکھے بغیر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس اسلام، مسلم اور پاکستان دشمنی کے پیچھے امریکہ، یورپ اور اسرائیل کا ہاتھ ہے، بھارت ان کا آلہ کار ہے اور افغانستان کی سرزمین کو وہ ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ پاکستان میں جو لوگ ان کے لیے کام کر رہے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

- سیاسی میدان میں ایم کیو ایم، معاشرتی و ثقافتی شعبوں میں اکثر میڈیا مالکان اور ان کے چندہ اینکرز و کالم نگار اور مذہبی حلقوں میں سے بعض بریلوی و شیعہ گروپ اس مقصد سے علانیہ اور زور شور سے مصروف عمل ہیں۔

- کچھ افراد اور ادارے اس مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن سبھاؤ اور حکمت عملی سے جیسے انتظامیہ میں سے سول اور فوجی بیوروکریسی اور سیاسی جماعتوں میں سے پیپلز پارٹی و اے این پی وغیرہ۔

- حکومت کا کردار یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہی ہے اور بے حس ہے، وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کو تیار نہیں۔

سوال یہ ہے کہ حکومت کا یہ طرز عمل کیوں ہے؟ مثلاً امریکہ اور اس کی سرپرستی میں بھارت بلوچستان، کراچی اور قبائلی علاقوں میں بد امنی اور شورش میں ملوث ہے۔ مذہبی دہشت گردی کے پیچھے بھی انہی کا ہاتھ ہے۔ کئی حکومتی ذمہ داران اسے سرعام تسلیم کر چکے ہیں۔ لیکن حکومت ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے بات نہیں کرتی اور ان سے نہیں کہتی کہ ختم کرو یہ جھنجھٹ ورنہ..... اور نہ ان کے

مقامی حمایتیوں اور ایجنٹوں پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ بلاشبہ ہماری معاشی حالت تپتی ہے۔ امریکہ و یورپ سے پنگ لینا آسان نہیں اور دوسری بہت سی نزاکتیں بھی ہیں لیکن آخر یہ سب کس قیمت پر؟ کیا ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سالمیت کی قیمت پر؟ نہیں صاحب! کوئی زندہ اور غیرت مند قوم یہ قیمت ادا نہیں کرتی۔ یہ تو صریحاً خودکشی ہے، جے جیتی ہے اور اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ دینی جماعتیں اور ادارے بھی اس کا تحریب کا ایک حصہ ہیں لیکن ہماری رائے میں ان کی اکثریت اس صورتِ حال کے خلاف جدوجہد کے شعور سے محروم ہے اور بے عمل ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ تعلیم جس رخ پر جاری ہے اور میڈیا جو کھل کھلا رہا ہے اس کے نتیجے میں دس بیس سال بعد معاشرے کی کیا حالت ہو جائے گی۔ اسلامی اصول و اقدار ہمارے معاشرے میں کتنے غیر مانوس اور اجنبی ہو جائیں گے اور ان کی جگہ مغربی اصول و اقدار کا چلن عام ہو جائے گا اور دینی افراد، جماعتیں اور ادارے سمندر میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی صورت اختیار کر لیں گے اور دن بدن سکڑتے اور سمٹتے چلے جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ طوفان کا کوئی بڑا ریلہ انہیں بہا لے جائے۔

اس دلدل سے نکلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں اس مشکل صورتِ حال اور اس کے ہولناک نتائج کا ادراک ہے وہ اکٹھے ہو جائیں اور مل کر:

- حکومت پر دباؤ ڈالیں اور اس کے لیے ہر ذریعہ اختیار کریں کہ حکومت اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں کو پورا کرے اور ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے سیدہ سیر ہو جائے اور غیر ملکی طاقتوں کو مجبور کرے کہ وہ اسلام اور پاکستان دشمنی سے باز آجائیں اور ان کے مقامی حمایتیوں اور ایجنٹوں کی اصلاح اور بیخ کنی کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کرے اور اسے حکمت سے نافذ کرے۔ ذہن سازی کے اداروں خصوصاً تعلیم اور میڈیا کا قبلہ درست کرے اور ملکی اداروں کی قلب ماہیت اور اصلاح و تربیت کے لیے مختصر اور طویل مدتی اقدامات کرے۔

- صرف حکومت کو توجہ دلانے اور اس پر انحصار کرنے کی بجائے اسلام اور پاکستان کے یہ حامی خود بھی میدانِ عمل میں اتریں اور جماعتی اور ادارہ جاتی تنگنائیوں سے نکل کر اسلام اور پاکستان کو بچانے کے لیے متحد ہو جائیں، خصوصاً ذہن سازی اور تعمیر شخصیت کے لیے تعلیم و تربیت اور میڈیا کے شعبوں میں کام کریں اور ریاستی اداروں کی اصلاح و تعمیر پر فوکس کریں تو اچھے نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کا ایک قابل عمل منصوبہ

ہم ۱۴ سال کے اندر پوری قوم کو تعلیم یافتہ اور ہنرمند بنا سکتے ہیں

پاکستانی قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے ہم جناب افتخار الدین منصور صاحب کا منصوبہ طبع کر رہے ہیں۔ آخر میں ان سے مختصر ڈائلاگ بھی ہے۔ ہم اس پر ماہرین تعلیم و اہل دانش کے تبصرے و تنقید کو خوش آمدید کہیں گے۔ ادارہ

مقاصدِ تعلیم

(۱) تعلیم کا بنیادی مقصد معرفت ذات ہے۔ ہر شخص اپنے امکانات جان کر شخصیت کی تشکیل جدید کے قابل ہو جاتا ہے، یہی خود گرد و خود گیر شخصیت ماحول کے ساتھ مکالمے سے اپنی راہ متعین کر سکتی ہے۔

تخلیق و تجدید کا سرچشمہ بھی فرد ہی ہے۔ معاشرہ اس کے لیے ماحول مہیا کرتا ہے، ایسا ماحول جس میں آزادی فکر و تحقیق کی مضبوط روایت موجود ہوتی ہے۔

افراد ہی زمانوں کے نمائندہ ہوتے ہیں، معاشرہ انہیں نشوونما کے لیے وسائل مہیا کرتا ہے۔ جو معاشرے مسلسل کسی غزالی، کسی آئن سٹائن کو پیدا نہیں کرتے رہتے وہ جو دکا شکار ہو کر کالعدم ہو جاتے ہیں۔ افراد ہی کے باہمی تعلق سے معاشرہ نشوونما پاتا ہے، افراد کے باہمی تعلق سے جس اخلاق پیدا ہوتی ہے جس کا تعلق گہرے انسانی شعور سے ہے۔ حسنِ خلق سے مزین افراد صحت مند معاشرہ کے قیام کا باعث بنتے ہیں۔

عقیدہ، یقین، مقصدیت اور پہل کرنے کی ہمت۔ ایسی خصوصیات ہیں جو فرد کی زندگی کو بامعنی بنا کر تخلیقی عمل کو ابھار سکتی ہیں۔

(۲) ملی نظامِ تعلیم کا دوسرا بڑا مقصد تہذیبی ورثے، علمی روایت اور بنیادی مقاصد کو تنقیدی جائزہ کے بعد اگلی نسل کو منتقل کرنا ہوتا ہے تاکہ اجتماعی زندگی کی تخلیقی تعمیر نو کا تسلسل برقرار رکھا جاسکے۔

(۳) علوم طبعی بھی ہیں اور روحانی بھی، شخصیت کی متوازن تعمیر کے لیے دونوں کے امتزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان نہ کائنات کے حوالہ کے بغیر رہ سکتا ہے نہ وراء الكائنات کے!

طبعی علوم کی نفی سے رہبانیت پیدا ہوتی ہے، انسان اچھی زندگی کے وسائل سے محروم ہو جاتا ہے، روحانی علوم کی نفی سے وحشت پیدا ہوتی ہے، انسان وسائل کے زیادہ سے زیادہ حصول کی آویزش میں مبتلا ہو کر ایک متوازن اور پُر امن معاشرتی زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ انفس و آفاق میں توازن فلاح انسانیت کی راہ ہے۔

(۴) ہمارا نظام تعلیم ہماری اپنی تہذیب و ثقافت، ہماری اپنی تاریخی روایت اور کائنات کے بارے میں ہمارے اپنے نقطہ نظر کے مطابق ہونا چاہیے۔ کسی بھی دوسرے نظام کی نقالی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔

(۵) معاش انسانی زندگی کے قیام کے لیے لابدی ہے، لیکن یہ مقصد حیات نہیں، ذریعہ حیات ہے۔ انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے باہمی تبادلہ اشیاء و خدمات سے معاشی وسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان وسائل کا معیار افراد کی علمی و ثقافتی سطح کے مطابق ہوتا ہے۔ اس غرض کے لیے تعلیم کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ معاشرے کی سائنسی و تکنیکی ضروریات کو بھی پورا کرے تاکہ افراد اپنی روزی عزت و وقار سے حاصل کر سکیں۔ یہ سارا عمل تعلیم و تعلم کے بغیر ممکن نہیں، جو معاشرے اس ضرورت کو پورا نہیں کرتے پس ماندہ رہ جاتے ہیں۔

اس وقت پاکستان کی صورت حال یہ ہے کہ:

- ۱۔ ہم تعلیمی لحاظ سے دنیا کے پست ترین ممالک میں شامل ہیں۔
- ۲۔ ہمارے تعلیمی اخراجات کم ترین سطح پر ہیں۔
- ۳۔ تعلیمی مسئلہ حل کرنے کے لیے سیاسی ارادہ مفقود ہے۔
- ۴۔ چھیا سٹھ سال گزر گئے ہیں، آبادی بڑھ رہی ہے اور (عملاً) تعلیم گھٹ رہی ہے، معاشرتی و معاشی حالت ناگفتہ بہ ہے، تشدد دن بدن حاوی ہو رہا ہے اور دور کسی افق پر بھی روشنی کا پتہ نہیں۔
- ۵۔ سیاستدانوں کی ترجیحات مختلف ہیں، ہر جگہ حکومت کی بالادستی قائم نہیں، خلا کو جب دوسرے

پُر کریں تو فساد پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ ایسے میں ایک ہی محفوظ راستہ ہے۔ معاملے کو عوام کے پاس لے آیا جائے، عوام میں احساس زیاں ابھار کر حالات سدھارنے کے لیے کہا جائے، حالات سدھارنے کی جب بھی بات ہوگی، تعلیم شمار ایک پر ہوگی۔

۷۔ اگر آج ہمارے اندر تعلیم حاصل کرنے کے لیے اجتماعی ارادہ پیدا ہو جائے تو ہم ان شاء اللہ اپنے وسائل کے استعمال سے چودہ سال کے عرصہ میں پوری قوم کو تعلیم یافتہ اور ہنرمند بنا سکتے ہیں۔

نظام تعلیم

۱۔ ابتداء میں تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

(۱) باقاعدہ تعلیم: چار سال کی عمر میں ہر بچہ مدرسہ میں داخل ہوگا اور وہ چودہ سال کی لازمی تعلیم حاصل کرے گا۔

(ب) ہنگامی تعلیم: i۔ انیس سے پچاس سال کی عمر کے اصحاب کے لیے

ii۔ پچاس سال سے بڑے اصحاب کے لیے۔

۲۔ (۱) پہلے قدم کے طور پر مناسب قانون سازی کے ذریعہ اٹھارہ سال عمر سے کم بچے کو کسی گھر یا دوکان یا کاروباری ادارہ یا کاشتکاری کے کسی مقام پر ملازم رکھنے کو جرم قرار دے دیا جائے گا۔ خلاف ورزی کرنے پر سزا ملازم رکھنے والے کو دی جائے گی۔

(ب) والدین بچے کو مدرسہ میں داخل کرانے اور باقاعدگی سے مدرسہ میں بھیجنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ بغیر معقول وجہ کے غیر حاضری پر والدین سے پوچھ گچھ کی جاسکتی ہے۔ ماحول میں نگہداری کا ایک انتظام کیا جائے گا کہ اوقات مدرسہ میں کوئی طالب علم گلی محلوں میں پھرتا ہوا نہ پایا جائے۔

۳۔ ابتدائی لازمی تعلیم چودہ سالوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ بچہ چار سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل ہوگا اور ایک سال بچہ کی مدرسہ کے ماحول سے انسیت پیدا کرنے کے لیے ہوگا۔ بچوں کے پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں مدرسہ میں باقاعدگی سے آنے اور تفریح و تعلیم کے مناسب امتزاج سے مدرسہ میں مصروف رہنے کی طرف مائل کیا جائے گا۔ دوپہر کو خوراک (دودھ اور بسکٹ وغیرہ) کا انتظام ہوگا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ بچے میں آوارہ پھرنے کے بجائے مدرسہ آنے کی ترغیب و عادت پیدا کی جاسکے، کم عمر، ماحول کی خوبصورتی، پیار، ضرورت کی طرف دھیان اور ہم عمر بچوں کا اجتماع..... یہ عناصر ذہنوں کی

بنانے اور بدلنے میں مدد دیتے ہیں۔

تیسرہ سال کی لازمی تعلیم کے بعد جو بچے مزید تعلیم (طب، ہندسہ، معیشت، انتظامیہ وغیرہ) کے لیے اعلیٰ تعلیمی اداروں یا جماعت میں چلے جائیں وہ تکمیل تعلیم کے بعد معاشرے میں واپس آئیں گے۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرنا چاہیں یا تعلیمی نتائج کے مطابق ایسا نہ کر سکتے ہوں، انہیں ایک سال کی خصوصی پیشہ ورانہ تربیت (بڑھئی، مستری، الیکٹریشن وغیرہ) دی جائے گی۔

۴۔ اٹھارہ سال کی عمر کے تمام بچے باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

(۱) ۴ سال کا بچہ ابتدائی جماعت میں داخل ہو کر ۱۳/۱۴ سال کی لازمی تعلیم حاصل کرے گا۔

(۲) ۵ سال کا بچہ ابتدائی + پہلی جماعت کا خصوصی نصاب ۱ سال میں مکمل کر کے ۶ سال کی عمر میں دوسری جماعت میں داخل ہو کر لازمی تعلیم پوری کرے گا۔

(۳) ۶ سال کا بچہ (۲+۱)..... کا خصوصی نصاب ۱ سال میں مکمل کرے گا اور ۷ سال کی عمر میں جماعت ۳ میں داخل ہوگا۔

(۴) ۷ سال کا بچہ (۲+۱)، ۱ سال، (۴+۳)، ۱ سال، ۹ سال کی عمر میں جماعت ۵

(۵) ۸ سال کا بچہ (۳+۱)، ۱ سال، (۴-۵)، ۱ سال، ۱۰ سال کی عمر میں جماعت ۶

(۶) ۹ سال کا بچہ (۳+۲+۱)، ۱ سال، (۴+۵)، ۱ سال، (۶+۷)، ۱ سال، ۱۲ سال کی عمر میں جماعت ۸

(۷) ۱۰ سال کا بچہ (۴+۱)، ۱ سال، (۵+۶)، ۱ سال، (۷+۸)، ۱ سال، ۱۳ سال کی عمر میں جماعت ۹

(۸) ۱۱ سال کا بچہ (۵+۱)، ۱ سال، (۷+۸)، ۱ سال، (۹+۸)، ۱ سال، ۱۴ سال کی عمر میں جماعت ۱۰

(۹) ۱۲ سال کا بچہ (۶+۱)، ۱ سال، (۹+۷)، ۱ سال، ۱۴ سال کی عمر میں جماعت ۱۰

(۱۳) ۱۳ سال کا بچہ (۸+۱)، ۱ سال، (۱۰+۹)، ۱ سال، ۱۵ سال کی عمر میں جماعت ۱۱

اسی طرح ۱۴ تا ۱۷ سال کے بچے دو، دو سال خصوصی تعلیم کے بعد ۱۱ ویں جماعت میں داخل ہوں گے۔ ۱۸ سال کے بعد یہ ان کی صوابدید ہے کہ ملازمت کریں اور بعد دوپہر جماعت میں باقی تعلیم مکمل کر لیں یا دن کو جاری رکھیں۔ ضروری نہیں کہ ان بچوں کو دو، دو ماہ کی چھٹیاں دی جائیں۔

اس طرح ۴ سے ۱۸ سال کے بچے پہلے ہی سال باقاعدہ یا خصوصی نصاب میں داخلہ کے ذریعے

باقاعدہ تعلیمی نظام میں شامل ہو جائیں گے۔

۱۹ سے ۵۰ سال تک کے اصحاب بعد دو پہر ۱۰ سال کا تعلیمی نصاب مکمل کریں گے۔

(۱) ان کا تعلیمی مرکز ان کے گھروں کے قریب ہوگا۔

(۲) ان کے نصاب میں کسی ایک ہنر کی اعلیٰ تعلیم اور عملی مشق شامل ہوگی۔

(۳) روزانہ تعلیم کا دورانیہ ۳ گھنٹے ہوگا۔

(۴) ان میں سے جو ہر قابل کے لیے اپنے تعلیمی نتائج کی بنیاد پر بعد دو پہر مدارس میں ۱۱ ویں جماعت میں داخلہ لے کر اپنی صلاحیت کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود ہوں گے۔

(۵) ضروری نہیں کہ انہیں سال میں دو ماہ کی چھٹیاں دی جائیں۔

۵۰ سال سے بڑے تمام اصحاب بعد دو پہر ۵ سالہ تعلیمی نصاب مکمل کریں گے۔

ان میں سے بھی جو ہر قابل کے لیے ان کی اپنی صوابدید پر مزید تعلیم کے مواقع موجود ہوں گے۔

۵۔ بچوں سے فیس ان کے والدین کی آمدنی کے مطابق لی جائے گی۔ والدین کی ایک مقررہ حد سے کم آمدنی والے بچے بغیر فیس کے تعلیم حاصل کریں گے۔

قلیل آمدنی والے یا بے روزگار والدین کے بچوں کے لیے مناسب وظائف کا انتظام بھی کیا جاسکتا ہے۔

ہر بچے کو جو رسید جاری کی جائے گی اس پر لکھا ہوگا 'واجبات ادا کر دیئے گئے'۔

کمرہ جماعت میں

(۱) بچوں کے فیس دینے یا نہ دینے کا کوئی ذکر نہ ہوگا۔

(۲) والدین یا خاندان کی حیثیت کا بھی کوئی ذکر نہ ہوگا۔

(۳) تمام بچے مدرسہ بسوں میں آئیں گے۔

(۴) تمام بچے ایک ہی قسم کے کپڑے کے لباس میں ملبوس ہوں گے۔

(۵) جماعت میں وجہ امتیاز صرف اور صرف قابلیت ہوگی۔

(۶) بچوں کے والدین کی حیثیت کے بارے میں معلومات صرف صدر مدرس کے پاس ہوں گی،

کسی استاد کے لیے یہ معلومات حاصل کرنا یا اگر معلوم ہوں تو ان کے مطابق کسی قسم کا امتیازی رویہ اختیار کرنا غیر قانونی ہوگا۔

ہر امتحان کے بعد بچوں کی درجہ بندی، حاصل شدہ نتائج کے مطابق ہوگی۔ اعلیٰ صلاحیت، درمیانی صلاحیت اور کمزور صلاحیت۔ کمزور صلاحیت کے بچوں کے لیے اوقات مدرسہ کے بعد خصوصی تعلیم کا انتظام ہوگا۔

(۶) سال کے بعد ہر بچے کو اگلی جماعت میں بھیج دیا جائے گا۔ کمزور صلاحیت کے بچوں پر خصوصی توجہ حسب سابق برقرار رکھی جائے گی۔

۱۱ سال کی یکساں تعلیم و تربیت کے بعد آخری دو سالوں میں علمی شعبوں کی تخصیص کر دی جائے گی (طبی، ہندسی، معاشی وغیرہ)۔ کمزور صلاحیت کے طلباء کو مختلف پیشوں کی علمی و عملی تربیت دی جائے گی۔ معاشرتی علوم سب کے لیے حسب سابق یکساں ہوں گی۔

(۷) اصل توجہ تین زبانوں پر مرکوز رہے گی، مادری، اردو اور عربی۔ ایک اور (چوتھی) زبان کا اختیار ہر طالب علم کو حاصل رہے گا۔

اردو رابطے اور علم کی زبان ہوگی۔ عربی ہماری ثقافتی زبان ہے، قرآن و حدیث براہ راست عربی زبان میں پڑھائے جائیں گے۔

(۸) چودہ سال کی لازمی تعلیم صرف سرکاری شعبہ میں ہوگی۔ نجی شعبہ اس میں قطعاً حصہ نہ لے سکے گا۔

نجی شعبہ اعلیٰ تعلیم اور تحقیقی شعبہ جات میں اپنا کردار ادا کرے گا۔ طبی، ہندسی، معاشی، تعلیمی اداروں اور اعلیٰ طبی علوم کے لیے جامعات میں طلباء کے لیے تحقیق کے مواقع مہیا کیے جائیں جو تحقیقی صلاحیت اجاگر کرنے میں معاون ہو سکیں۔

(۹) باقاعدہ تعلیم کی طرح خصوصی نصابات میں بھی طلباء کو معیار پر پورا نہ اترنے کے باوجود اگلی جماعتوں میں بھیج دیا جائے گا۔

جہاں تک معیار کا معاملہ ہے تمام بچے پیدائشی طور پر ذہنی صلاحیتوں میں برابر نہیں ہوتے۔ آپ ایک پست ذہنی صلاحیت کے بچے کو ایک حد سے اوپر نہیں اٹھا سکتے۔ یہ اثر اس صورت میں اور بھی گہرا ہو جاتا ہے جب بچے کے باپ دادا میں تعلیم کی کوئی روایت نہ رہی ہو۔ استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر عمومی طور پر ایسے

بچوں کو تعلیم دینا ایک کٹھن مرحلہ ہے لیکن انہیں ان پڑھ چھوڑ دینا خود ان کے لیے اور مجموعی تعلیمی صورت حال کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں (خصوصی توجہ کے ساتھ) پورے تعلیمی نظام سے گزار دیا جائے۔ ساتھ ہی انہیں کسی نہ کسی پیشہ کے لیے تیار کر دیا جائے۔ اس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ چند نسلوں میں یہ اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کے قابل ہو سکیں گے۔

یہ ساری کاوش صرف پہلی بار کے لیے ہوگی۔ ایک بار ہمت سے ارادہ کر لیا جائے تو سو فیصد تعلیم کا ہدف (جو کچھ بھی معیار ممکن ہے، اس کے مطابق) حاصل ہو سکے گا۔ آئندہ صرف باقاعدہ تعلیمی نظام رہ جائے گا۔ مسلسل کوشش سے معیار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

تعلیمی نظام کو بتدریج درست کرنے اور وسعت دینے کا نظریہ غلط، ناقابل عمل اور ہمارے گزشتہ تجربے کے خلاف ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے اجتماعی معاملات میں بالغ نظری کا ثبوت نہیں دیا۔ سیاسی معاملات ہوں، تعلیمی یا معاشی معاملات، ہر جگہ ”وقت گزاری“ کی گئی۔ ہم حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی بجائے آنکھیں چرا کر ادھر ادھر نکلتے رہے جس کی وجہ سے حالات نے ہمیں گھیر کر نڈھال کر دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!

ایک قابل عمل سچی راہ ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنا، اپنی صلاحیتوں کی دریافت اور اپنے پاؤں پر چلنا خواہ پاؤں کتنے بھی زخمی ہوں۔

پہلا قدم جو ہم اٹھائیں گے وہ حصول تعلیم کا ہوگا۔ ہر پاکستانی فرد تعلیم یافتہ ہو، اپنے ماضی اور اپنے حال کو جانتا ہو اور مستقبل کی جانب اعتماد سے نظر اٹھانے کے قابل ہو۔ وہ صرف علم حاصل ہی نہ کرے علم تخلیق بھی کرے۔ دنیا سے محض لے ہی نہ دینے کے قابل بھی ہو۔

اس کے لیے کام ہنگامی بنیادوں پر کرنا ہے۔ پہلے ایک نظام بنانا ہے اور پوری قوم کو اس میں سے گزار کر تعلیم سے ہمکنار کر دینا ہے اور پھر ایک منظم معاشرے کی قوت کے ساتھ حالات کی باگ اپنے ہاتھ میں لینی ہے۔

(۱۰) حصول تعلیم کے لیے عمر کی قید ختم کر دی جائے گی، تعلیم کسی معاشی، سیاسی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ ایک بنیادی حق کے طور پر حاصل کی جائے گی۔ کوئی بھی شخص کسی بھی عمر میں جب چاہے اپنے گزشتہ تعلیمی نتائج کو بہتر کرنے کے لیے یا آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے تعلیمی اداروں میں داخل ہو کر یا قواعد کے مطابق اپنے طور پر امتحانات میں حصہ لے سکتا ہے۔

کوئی شخص وسائل کی کمی کی وجہ سے تعلیم سے محروم نہیں رہ سکے گا۔ حکومت (یا نجی اداروں) کے پاس قرضے مہیا کرنے کے لیے قواعد اور ضمانتوں کا ایک نظم ہوگا جس کے تحت تکمیل تعلیم اور حصول ملازمت کے بعد یہ قرضہ جات واپس کیے جاسکیں گے۔

(۱۱) تعلیمی سال یکم جنوری سے ۳۱ دسمبر کر دیا جائے گا۔

داخلوں، امتحانوں اور نتائج کے اعلانات کی تاریخیں مقرر کر دی جائیں گی۔

(۱۲) دارالترجمہ: بجائے اس کے کہ ایک انگریزی کتاب پڑھنے کے لیے پوری قوم انگریزی زبان پڑھے، انگریزی کتاب کو اردو زبان میں منتقل کر دیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے ایک مرکزی دارالترجمہ قائم کرنے کی ضرورت ہے جہاں:

۱- ہر شعبہ تعلیم کے ماہرین ہونے چاہئیں جو ترجمہ کرنے میں مہارت رکھتے ہوں۔

۲- ہر شعبہ علم کی نمائندہ کتب کا ترجمہ کر دینا چاہیے۔

۳- ہر نئی چھپنے والی قابل لحاظ تحقیقی، ادبی، تاریخی (وغیرہ) کتاب کا ترجمہ ہو جانا چاہیے۔

۴- دارالترجمہ سے منسلک ایک ذخیرہ کتب ہونا چاہیے جس میں دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں چھپنے والی کتب موجود ہوں۔ اس کی شاخیں تمام بڑے شہروں میں ہوں اور آپس میں مربوط ہوں۔

۵- دارالترجمہ سے منسلک ایک چھاپہ خانہ بھی ہو جو ہر قسم کی جدید سہولیات سے آراستہ ہو۔

۶- دارالترجمہ ہی سے منسلک ایک ادارہ زبان دانی ہونا چاہیے جہاں دنیا کی بڑی زبانیں سیکھی جاسکیں۔ زبان سیکھنے کی جدید سہولیات موجود ہوں۔ ہر شعبہ کو اہل زبان کی نگرانی میں ہونا چاہیے۔

اس ادارہ کی شاخیں تمام بڑے شہروں میں ہوں اور باہم مربوط بھی ہوں۔

(۱۳) جمعیت برائے تیاری نصاب و تخصیص نتائج

(۱) یہ جمعیت طلباء کے لیے مقاصد تعلیم کو سامنے رکھتے ہوئے تمام مراحل کے نصابات تیار کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

جمعیت کے پاس ایک مستقل نظام کار ہوگا جس کے ذریعہ وہ جانچ کرے گی کہ:

۱- علم کو محض رٹا گیا ہے یا سمجھا بھی گیا ہے۔

۲- کیا علم کی مطلوبہ سطح تک پہنچا جاسکتا ہے؟

۳۔ کیا علم کو تجربہ میں لانے کی صلاحیت اجاگر ہوئی؟

۴۔ مقاصد تعلیم کے لحاظ سے طلباء کا معیار کیا ہے؟

جمعیت فحیص و نظر ثانی کے عمل کو مسلسل جاری رکھے گی اور نصاب میں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ طریق تعلیم وغیرہ کے بارے میں اپنی تجاویز اور ان پر عمل درآمد پر نظر رکھے گی۔

(ب) اساتذہ کے لیے مرحلہ وار تعلیمی معیار مقرر کرنا اور ان کی تعلیم و تربیت کا ایسا نظام وضع کرنا جس سے اساتذہ میں علم کو طلباء تک منتقل کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت پیدا ہو سکے۔

طلباء سے استادانہ دھونس کے بجائے اخلاقی و علمی برتری سے متاثر کرنے کے لیے مناسب رہنمائی فراہم کرنا۔

پیسہ کہاں سے آئے گا؟

(۱) جہاں تک جاری اخراجات کا تعلق ہے، اگر ۱.۸ فیصد تخمینہ سے ۵۰ فیصد سے زائد طلباء تعلیم حاصل کر سکتے ہیں تو ۱۴ یا ۱۵ فیصد سے ۱۰۰ فیصد طلباء کے اخراجات پورے کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ہمیں دنیا میں عزت سے رہنا ہے تو ہمارے تعلیمی اخراجات کا اندازہ ۱۰ فیصد ہونا چاہیے۔

(۲) اصل مسئلہ وہ خرچہ ہے جو مدرسوں کی عمارات اور سامان وغیرہ پر اٹھے گا، یہ خرچہ ۵۰۰ ارب روپیہ تک ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اتنا مشکل نہیں کہ ہم اسے برداشت نہ کر سکیں۔ اگر ایک صوبہ گیارہ ماہ میں ایک سڑک کی تعمیر کے لیے ۳۰ ارب روپیہ نکال سکتا ہے یا مرکز ۲۸۰ ارب روپیہ کا گردش قرضہ یکمشت ادا کر سکتا ہے تو ایک سال کے لیے ۵۰۰ ارب روپیہ نکالنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خرچہ ایک ہی بار ہونا ہے اور مسئلہ یہاں بھی صرف سیاسی ارادہ کا ہے۔ اگر ایک (یا زیادہ سے زیادہ دو) سال کے لیے سڑکیں اور اس طرز کے ترقیاتی اخراجات کو روک دیا جائے تو یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس کی ترتیب کچھ یوں ہو سکتی ہے:

(۱) ایک سال کے لیے کل ترقیاتی تخمینہ مدرسوں کی عمارات کی تعمیر اور سامان کے لیے مختص کر دیا جائے۔

(ب) ملک میں ایک سال کے لیے عمارات کی تعمیر ممنوع قرار دے دی جائے تاکہ سارا سامان تعمیر مدارس کی عمارات کے لیے حاصل ہو سکے۔

(ج) منصوبہ بندی: یہ معلوم کیا جائے کہ:

(۱) کل ان پڑھ بچوں کی تعداد کتنی ہے؟

(۲) جغرافیائی طور پر وہ کہاں کہاں کس تعداد میں موجود ہیں؟

(۳) مدرسہ جات کہاں کہاں بنائے جائیں گے اور یہ کہ کسی بھی جگہ مدرسہ کا حجم کیا ہوگا۔ جس کا تعلق وہاں پر طلباء کی تعداد سے ہوگا۔

(۴) تمام چھوٹے بڑے مدارس کے معیاری نقشہ جات تیار کر لیے جائیں، جہاں بھی جس حجم کا مدرسہ بنے گا، انہی نقشوں کے مطابق بنے گا۔

(۵) تمام مدارس کی ضروریات کو یکجا کر لیا جائے گا۔ کل سینٹ کی مقدار کے بارے میں تمام سینٹ پیداواری اداروں کو آگاہ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح سر یا بنانے والوں کو مانگ کا پہلے سے پتہ ہوگا اور وہ اسے مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اسی صورت میں دروازے، الماریاں، بیچ اور دیگر سامان بنوا لیا جائے گا۔

یہ کام مکانات بنانے والے ٹھیکیداروں اور مزدوروں سے لیا جائے گا۔ کسی بھی تعلیمی نظام کی ابتدا کے لیے جس میں ہماری ملی ضروریات کو مد نظر رکھا گیا ہو اور اس میں سو فیصد شہریوں کو شامل کرنا مقصود ہو، مندرجہ ذیل مشکلات درپیش ہوں گی:

(۱) حاجت مند والدین ہرگز یہ پسند نہ کریں گے کہ ان کے بچے جو کچھ کم کر ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں وہ محض تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا بند کر دیں۔ بعض بہت غریب لوگوں کے لیے ایسا کرنا واقعی مشکل بھی ہو سکتا ہے۔ حکومت کے پاس غرباء کو نقد ادائیگیوں کا نظام موجود ہے، اس میں ان مستحق گھرانوں کی امداد کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔

(۲) وہ خاندان جن کے ہاں یہ بچے کام کرتے ہیں وہ نہیں چاہیں گے کہ ان بچوں کو فارغ کر کے ان سے حاصل ہونے والی سہولتوں سے دست بردار ہو جائیں۔

اس کے علاوہ گھروں میں نوکروں سے کام لینا ہماری تہذیب کا حصہ بن گیا ہے۔ ہر کوئی نوکروں کی تعداد کو ذریعہ فخر سمجھے ہوئے ہے، خواتین گھر کے کام کو عارضہ سمجھتی ہیں، وہ انہی بچوں سے کام لیتی ہیں۔ تعلیم کو آگے بڑھانے کے لیے ایک بنی بنائی تہذیبی روش کو ختم کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، جس پر کام کرنے اور کام لینے والوں دونوں متفق اور مطمئن ہیں، یہ کوئی آسان کام نہیں ہوا کرتا، اس کے اب تک نہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ کوئی اسے کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

ظاہر ہے کہ تعلیم لازمی ہونے کی صورت میں یہ بچے ملازمت کے لیے دستیاب نہ ہوں گے۔

(۳) مقتدر اور سرمایہ دار طبقہ نجی اور انگریزی سکولوں کی سہولیات سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

ہمارے ہاں انگریزی میں اہلیت ایک ایسا زینہ بن گیا ہے جو اقتدار کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اخراجات کر کے اپنے بچوں کو ”انگریزی سکولوں“ میں پڑھانا پسند کرتے ہیں۔

(۴) ہمارا معاشرہ تقسیم در تقسیم کے عمل سے گذر رہا ہے، انحطاط کی زد میں آیا ہوا ہر معاشرہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک ”لبرل“ طبقہ سرمایہ دار بھی ہے، مقتدر بھی ہے اور اسے بیرونی (خصوصاً فرنگی) امداد و بلاشیری بھی حاصل ہے۔ ملک میں افواج اور عدالتی، تعلیمی اور معاشی نظام انہی کے اقتدار میں ہیں۔

یہ طبقہ پرانی روایات کی بے توقیری، طبعی علوم کی کار سازی اور نسوانی بے حجابی کا دلدادہ ہے۔ ان کے مقابلہ میں جو پرانی روایات کا حامل طبقہ ہے وہ اصحاب فقہی، مسلکی، بحثوں میں مشغول رہتے ہیں، عبادت کو کامیابی کا زینہ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنی طرز کے اداروں کو خوش اسلوبی سے چلاتے ہیں۔ ان کا نظام تعلیم بھی علیحدہ ہے۔ جسے ”دنیاوی“ تعلیم سے الگ رکھا گیا ہے۔

ان دونوں طبقات میں معتدل اور متشدد رویے موجود ہیں، کئی مقامات پر باہم متزاحم بھی ہیں۔ یہی رویے یکساں تعلیمی نظام کی راہ میں رکاوٹ بنتے رہے ہیں۔

یہ وہ مسائل ہیں جو قانون سے حاصل نہیں ہو سکتے، ہو سکتے بھی ہوں تو قانون کی قوت انہیں حل کرنے کے لیے موجود نہیں!

یکساں لازمی تعلیم کا انتظام چونکہ عوام سرکاری شعبہ ہی میں ممکن ہے، سیاستدانوں کی آمدگی کے بغیر یہ ممکن نہیں، یہ اصحاب کوئی بھی کام کرنے کے لیے رائے عامہ کے دباؤ کے علاوہ کسی اور دلیل سے راضی نہیں ہوتے۔

یہ مسئلہ عوام کے پاس جانے سے حل ہوگا، انہیں بتانا ہوگا کہ جہالت سے نکلے بغیر وہ نہ اپنے حقوق کا تعین کر سکتے ہیں اور نہ انہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوتے اور نئے حقائق پیدا نہیں کرتے، حالات کو نہیں بدلا جاسکتا۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے، نتائج کا تعلق اس سے ہوگا کہ عوامی بیداری کی اس تحریک کو

کون لوگ چلا رہے ہیں۔ اگر اس تحریک کو کسی بھی سطح پر پرانے کھلاڑی اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں تو ہو سکتا ہے حصول تعلیم کے مواقع میں کچھ بہتری آ جائے یا عوام کی محرومیوں میں کچھ کمی ہو جائے لیکن عمومی حالات میں کوئی جوہری فرق نظر نہ آئے گا۔

ہمیں ایک ایسی فضا بنانا ہوگی جس میں یہ مسائل بغیر اختلافات کو ہوا دیئے آسانی سے طے ہو سکیں، عوامی رہنمائی کے لیے طبقاتی احساسات کو مد نظر رکھتے ہوئے اعتدال کی راہ تلاش کرنا ہوگی جس پر اختلافات اور بعض اوقات متضاد خیالات کو براہیختہ کیے بغیر آگے بڑھا جاسکے، مسلسل محنت اور لگن سے مختلف طبقات کو یہ باور کرانا لازمی ہے کہ موجودہ حالات سے نکلنے کے لیے عوامی بیداری کے ذریعہ سو فیصد تعلیم کے حصول اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے سوا آگے بڑھنے کا کوئی متبادل موجود نہیں۔ بے غرضی اور ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے تکرار اور خلفشار کی اس فضا میں محبت و اخوت کا پیغام دیا جانا چاہیے۔

اگر ایک گروہ تن من دھن کی پرواہ کیے بغیر میدانِ عمل میں نکل آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ بہت جلد عوامی توجہ حاصل کر کے مطلوبہ مقاصد کی طرف بڑھانہ جاسکے۔ اگر خلوص نیت اور للہیت کو برقرار رکھا جائے، مخالفت پر رد عمل کے بجائے مثبت جذبات یگانگت کا اظہار کیا جائے، فساد کے مقابلہ کے لیے صبر اور برداشت کو ڈھال بنالیا جائے تو بس، اجتماعی سدھار کی یہی راہ ہے، جس کے ذریعہ مثبت نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اس کے لیے ہمیں چاہیے:

i- تمام سیاسی، مذہبی و سماجی جماعتوں کے ساتھ گفتگو، ان کے کارکنوں کا تعاون حاصل کرنا اور ان کی قیادتوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنا۔

ii- رائے عامہ کو متاثر کرنے والے تمام ابلاغی ذرائع سے تعاون حاصل کرنا اور ان کے ذریعہ لوگوں تک بات پہنچانے کی کوشش کرنا۔

iii- اجتماعات، چھوٹے: محلوں میں لوگوں کو جمع کرنا اور اپنی بات کہنا

بڑے: قصبوں، شہروں کے مرکزی مقامات پر جمع ہونا اور رائے عامہ کو متاثر کرنے والے حضرات کو وہاں لانے کی کوشش کرنا۔

iv- مظاہرے: خاموش: جیسے ایک کتبہ اٹھا کر کسی مصروف اور پُر ہجوم بازار میں سے گزر جانا۔

صوتی: چند حضرات کا کتبے کے ساتھ مکبر الصوت پر اپنی بات کہتے ہوئے گزر جانا۔

- v- اخبارات میں مضامین چھپوانا، مدیران سے گفتگو کر کے ان سے حمایت میں لکھوانا۔
- vi- طلباء تنظیموں کے ذریعہ طلباء کو عوامی رابطے کے لیے تیار کرنا۔
- vii- مدارس کے اساتذہ تک رسائی۔
- viii- مقتدر سیاستدانوں (اسمبلیوں، پارلیمنٹ، سینیٹ کے ارکان وغیرہ) سے مسلسل رابطے اور انہیں تعلیمی ترقی کی طرف راغب کرنا۔
- ix- کاروباری تنظیموں کے ذریعہ کاروباری طبقہ تک رسائی۔
- x- اشتہارات اور کتابچوں کی وسیع اشاعت اور مزید بھی جو کچھ ہو سکتا ہے۔
- اگر ایک بار معاشرہ کسی بھی سطح پر منظم ہو جائے اور مناسب رہنمائی کی کوئی صورت بن جائے تو اس سے جو تحریک حاصل ہوگا اسے حکمت سے استعمال کر کے دوسرے مسائل کو حل کرنے کی طرف بھی بڑھایا جاسکتا ہے۔
- اس زمانہ میں ہمارے بڑے بڑے مسائل یہ ہیں:
- ۱- مقصدِ حیات انسانیت اور بھائی چارہ ہو، معاش نہ ہو۔
 - ۲- تعلقات کی بنیاد انصاف ہو، ظلم نہ ہو۔
 - ۳- کسی بھی سطح پر بدعنوانی اور بے حیائی نہ ہو۔
 - ۴- تمام درست وسائل کو بروئے کار لا کر بہتر اور خوش حال زندگی کی تعمیر ہو۔

.....

البرہان:

ہم نے یہ مضمون موصول ہونے پر مصنف کو لکھا کہ:

- ☆ آپ کا منصوبہ حکومت کے لیے ہے اور حکومتوں کا حال آپ کو معلوم ہے۔ حکومت کو اس کا قائل، اس پہ مائل اور اس کے نفاذ پر مجبور کرنے کے لیے بھی کوئی لائحہ عمل ہونا چاہیے۔
- ☆ اگر حکومت اس پر عمل نہ کرے تو پرائیویٹ سیکٹر کے لیے آپ کوئی کردار کیوں تجویز نہیں

کرتے؟ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ پھر ماضی میں نظام تعلیم مسلم معاشرے کے ہاتھ میں تھا نہ کہ ریاست و حکومت کے، تو اب یہ کیوں ناممکن ہے؟

☆ آپ اپنے مضمون میں ہر جگہ یہ اسلوب استعمال کرتے ہیں کہ ”یہ کریں گے“ وہ کریں گے، یہ قدم اٹھائیں گے جب کہ تجویز کا اسلوب ہونا چاہیے کہ یہ کیا جائے یا یہ کرنا چاہیے۔

☆ اگرچہ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ آپ تعلیم کی مغربیت (Westernization) کی حمایت نہیں کرتے اور اس کے مقامی کردار و مزاج کے حامی ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک دفعہ بھی اسلام اور نظریہ پاکستان کے الفاظ استعمال نہیں کیے حالانکہ ملک اسی کے نام پر وجود میں آیا۔ آئین اس کی حمایت کرتا ہے اور آج تک جتنے قوانین اور قومی تعلیمی پالیسیاں بنی ہیں وہ اس کی توثیق کرتی ہیں!

افتخار الدین منصور:

(مصنف نے ہمارے خط کے جواب میں لکھا کہ)

(۱) سلطنت کے لیے معاشرہ کے اپنے تنظیمی ڈھانچہ کی وحدت کی بجائے حاکم و محکوم کی شویت کی روایت پر عرب بادشاہت استوار ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زبردست اخلاقی اثر کی وجہ سے لوگوں نے اپنی ترتیب علیحدہ رکھی جو مور زمانہ سے محکوم ہی بنے۔ عوام اگر حق خود ارادیت کے قابل ہوں تو وحدت بنتی ہے نہ ہوں تو شویت! علم و کردار کی رہنمائی میں افراد معاشرہ کی تعلیم و تربیت سے عوامی حق خود ارادیت کی تعمیر ہی معاشرتی وحدت پیدا کر سکتی ہے۔

یوں بھی اگر لازمی تعلیم نجی شعبہ کے سپرد کی جائے تو وہی ہوگا جواب تک ہو رہا ہے، وہ تو گویا موجود کو دوام بخشنا ہوا، طبقاتی تقسیم بھی وہی رہے گی، آگے بڑھنے کی رفتار بھی وہی!

(۲) اس تجویز کے تحت یوں ہوگا، یا اسے یوں ہونا چاہیے، قریب المفہوم ہیں، گوسارے مفہام صد فیصد ہم معنی نہیں ہوتے۔ یہ اسلوب ارادتنا اختیار نہیں کیا گیا۔

(۳) معروف اصطلاحات ارادتنا استعمال نہ کرنے کی وجہ (جیسا کہ متن میں بھی عرض کیا گیا ہے) یہ ہے کہ تمام طبقات (خصوصاً لبرل طبقہ) کو ساتھ رکھا جاسکے۔ نتائج کا تعلق اس حقیقت سے ہوگا کہ عوامی بیداری کے لیے رہنمائی کن لوگوں کے ہاتھ میں ہے!

مسلم ممالک کے باشندوں کے لیے بلاد کفار کی شہریت غیر شرعی ہے

کچھ عرصہ پیشتر جب ملک میں اہم سرکاری مناصب پر پاکستان کے علاوہ غیر مسلم ممالک کی شہریت قبول کرنے کا معاملہ زیر بحث تھا تو ماہنامہ حکمت بالغہ جھنگ کے مدیر اور تنظیم اسلامی کے رہنما جناب انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب نے ایک استفتاء ملی مجلس شرعی کے علماء کے پاس بھیجا کہ غیر مسلم ممالک کی شہریت قبول کرتے وقت جو حلف اٹھایا جاتا ہے، وہ نقیض اسلام ہے یا نہیں؟ بوجہ یہ معاملہ ملی مجلس شرعی کے علماء کرام کے ہاں تو اب تک زیر غور نہیں آ سکا البتہ ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی طالب علما نہ جسارت کی ہے تاکہ علماء کرام جب اس موضوع پر غور فرمائیں تو یہ نقطہ نگاہ بھی ان کے سامنے رہے۔ مدیر

سوال کی نوعیت

اگرچہ مستفتی نے صرف اتنا سوال پوچھا ہے کہ غیر مسلم ممالک کی شہریت کے لیے جو حلف اٹھانا پڑتا ہے وہ خلاف شریعت ہے یا نہیں لیکن غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سوال سے جڑا ہوا دوسرا سوال یہ ہے کہ کسی غیر مسلم ملک میں جا کر رہائش اختیار کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کا مطلب اور مقصد یہی ہے کہ ایک مسلمان وہاں جا کر رہے۔ بلکہ مناسب ہوگا کہ اس دوسرے سوال کا پہلے جواب دے دیا جائے کیونکہ اگر کسی غیر مسلم معاشرے میں رہنے کا شرعی جواز ثابت نہ ہو سکے تو لامحالہ ایسے ملک کی شہریت اختیار کرنے اور اس کے لیے حلف اٹھانے کا جواز بھی کمزور ہو جائے گا لہذا پہلے ہم اس بات پر غور کریں گے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور پھر اس بات کی طرف آئیں گے کہ اس مقصد سے کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا اور اس کے لیے ایسا حلف اٹھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے جس میں کافرانہ قوانین کی اطاعت اور کافر ریاست کی حفاظت کی خاطر جان دینے کا عہد کرنا پڑے۔ واللہ المستعان

غیر مسلموں کے ساتھ معاشرت اختیار کرنا

اس ضمن میں قرآن و سنت سے، جو ہمارے دین کا بنیادی ماخذ ہیں، ہمیں بعض بنیادی اصولوں کا

پتہ چلتا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ الگ مسلم تشخص

مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا (یعنی بحیثیت ملت، قوم، معاشرہ اور ریاست) ایک مستقل اور الگ تشخص اور پہچان (identity) ہونی چاہیے تاکہ وہ غیر مسلموں ☆ سے ممتاز اور منفرد نظر آئیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی وضع قطع غیر مسلموں سے مختلف ہونی چاہیے اور فرمایا کہ ”داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ“^(۱) کیونکہ اس زمانے میں غیر مسلم داڑھی کٹواتے اور مونچھیں بڑھاتے تھے۔ اسی طرح وضع قطع میں غیر مسلموں کی سی مشابہت اختیار کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ ”جو ان کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے“^(۲) اور اجتماعی زندگی میں غیر مسلموں کے تہواروں کو ترک کر کے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دو تہوار مقرر کرنا^(۳) اور ان کے ۹ محرم کے روزے کے مقابلے میں ۹ اور ۱۰ دو دن کا روزہ رکھنے کا اعلان کرنا^(۴) اور اللہ تعالیٰ کا مسجد اقصیٰ کی بجائے مسجد حرام کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر کرنا^(۵) وغیرہ شامل ہیں۔

مسلمانوں کی الگ پہچان اور منفرد تشخص کے حوالے سے شریعت یہ اصول بھی وضع کرتی ہے کہ غیر مسلموں کی مخالفت کی جائے چنانچہ بہت سارے معاملات میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”خالفوا المشرکین والیہود۔۔۔“^(۶)۔ یہ سپرٹ ہمیں قرآن و سنت میں ہر کہیں نظر آتی ہے مثلاً مناسک حج کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ طواف وقار سے کرو اور کفار کی طرح بیٹیاں نہ بجاؤ اور سب لوگوں کی طرح عرفات تک جاؤ اور وہاں قیام کرو اور اس سے پہلے ہی واپس نہ لوٹ آؤ اور کفار کے ذکر آبا و اجداد کی بجائے اللہ کو کثرت سے یاد کرو،^(۷) حرام مہینوں کا اول بدل نہ کرو،^(۸) لڑکیوں کو زندہ دفن نہ کرو،^(۹) مرحوم باپ کی بیویوں سے شادی نہ کرو^(۱۰)۔۔۔ اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ داڑھی کٹواتے اور مونچھیں بڑھاتے ہیں تم اس کے برعکس کرو۔ وہ سراور داڑھی کے بالوں کو نہیں رنگتے تم رنگو^(۱۱)۔ وہ حیض کے دنوں میں بیویوں کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں تم نہ چھوڑو^(۱۲) وغیرہ۔

* غیر مسلموں کا لفظ ان سب افراد، قوموں اور ملتوں کو محیط ہے جو اس حق کا انکار کریں جو حضرت محمد ﷺ لے کر مبعوث ہوئے تھے خواہ وہ خدا، رسول، آخرت اور انبیاء و کتب آسمانی کو نہ ماننے والے مشرک، کافر اور بت پرست ہوں یا سابقہ مخرف ادیان کو ماننے والے یہود و نصاریٰ ہوں جن کا تصور توحید و رسالت بگڑ چکا ہے اور وہ حضرت محمد ﷺ کو نبی نہیں مانتے، اگرچہ ثانی الذکر کے لیے بعض (مشروط) مراعات سنت سے ثابت ہیں جیسے ان کا ذبیحہ کھانا (اگر وہ اس پر اللہ کا نام لیں) اور ان کی عورتوں سے شادی کرنا (بشرطیکہ وہ محصنہ ہوں) وغیرہ۔

۲۔ کفار کی اسلام و مسلم دشمنی

قرآن علی الاعلان یہ کہتا ہے کہ کفار اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں لہذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان سے ’ولاء اور دوستی کا تعلق نہ رکھیں:

- یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ [المائدہ 51:5]

”اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ“

- وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں تمہارے نہیں

بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ [المائدہ 51:5]

”وہ (صرف) ایک دوسرے کے دوست ہیں“

- جو ان سے دوستی کرے وہ انہی میں سے ہے

وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ [المائدہ 51:5]

”تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا وہ انہی میں شمار ہوگا“

- جو ان سے دوستی کرے وہ ظالم ہے اور ہدایت الہی سے محروم ہے

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ [المائدہ 51:5]

”بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا“

نوٹ: چھٹی صدی ہجری کے عظیم اندلسی عالم، فقیہ، محدث اور سیرت کی معروف کتاب

”الشفاء“ کے مؤلف قاضی ابن عیاضؒ نے اپنی کتاب ”مصابح الارواح فی اصول الفلاح“ میں اس

آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ان مسلمانوں کی تکفیر کی ہے جو یہودیوں کے ساتھ دوستی کا تعلق رکھیں اور ان کی

حمایت کریں (۱۳)۔

- یہودی اور مشرک عیسائیوں سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کے دشمن ہیں

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا

[المائدہ 82:5]

”ایمان والوں کے ساتھ دشمنی میں تم سب سے بڑھ کر یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے“

- اہل کتاب اور کفار اسلام دشمن ہیں ان سے دوستی کرو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُؤًا وَلَعِبًا مِّنْ

الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكَفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ [المائدہ 57:5]

”اے ایمان والو! اہل کتاب اور کافروں میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، انہیں اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔“

- ان کو رازدار نہ بناؤ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ [آل عمران 118:3]

اے ایمان والو! غیر مسلموں کو (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو، کیونکہ سابقہ آیات میں انہی کا ذکر ہے) اپنا رازدار نہ بناؤ۔“

- یہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں

لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا [آل عمران 118:3]

”وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔“

- یہ تمہارے بدخواہ ہیں

وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ [118:3]

”وہ چاہتے ہیں کہ تم مشکل میں پڑو۔“

- ان کی مسلم دشمنی ان کے ظاہر سے بھی نمایاں ہے

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ [آل عمران 118:3]

”ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہے۔“

- اور ان کے دلوں میں تو تمہارے خلاف زہر بھرا ہوا ہے

وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ [118:3]

”اور جو بغض ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔“

- وہ تمہارے دوست نہیں ہیں

هَآنَتُمْ أَوْلَاءَ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ [119:3]

”تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے۔“

- وہ تمہارے خلاف غصے، نفرت اور انتقام سے بھرے بیٹھے ہیں

وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَنْكُمْ إِلَّا نَامِلًا مِنَ الْعِطِ [119:3]

”جب وہ تم سے الگ ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی

- انگلیاں چباتے ہیں۔“
- تمہاری خوشی اور خوشحالی سے ان کو تکلیف ہوتی ہے
 اِنْ تَمَسَسْتُكُمْ حَسَنَةً تَسُوْهُمْ [آل عمران 120:3]
 ”اگر تمہارے حالات اچھے ہوں تو انہیں رنج ہوتا ہے۔“
- اور تمہاری تکلیف سے وہ خوش ہوتے ہیں
 وَ اِنْ تُصِيبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا [آل عمران 120:3]
 ”اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔“
- یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں کہ تم بے دین ہو جاؤ اور ان کی پیروی کرو
 وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصْرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ [120:2]
 ”یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کا مذہب اختیار نہ کرلو۔“
- یہود و نصاریٰ کی پیروی اللہ کی ناراضی کا سبب ہے
 وَلَئِنْ اَتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ [120:2]
 ”اور اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آ جانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو اللہ کے مقابلے میں تمہارے کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔“
- کفار سے دوستی نہ کرو
 یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکَافِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَتْرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا. [النساء 4:144]
 ”اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے خلاف اللہ کی کھلی حجت قائم کرالو“
- یہی عقل و دانش پر مبنی رویہ ہے
 قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ [118:3]
 ”اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تمہارے لیے تمام نشانیاں واضح کر دی ہیں۔“
- اللہ کا راستہ ہدایت کا راستہ ہے، کفار سے دوستی اور پیروی کا نہیں
 قُلْ اِنَّ هٰدِیَ اللّٰهَ هُوَ الْهُدٰی [120:2]

”ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی سچی ہدایت ہے۔“

ان آیات کے بارے میں مغربی ممالک کا یہ پراپیگنڈا غلط ہے کہ قرآن مسلمانوں کو دوسروں سے نفرت سکھاتا ہے کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے یہ نہیں کہا کہ وہ غیر مسلموں سے نفرت کریں یا ان سے دشمنی کریں یا ان سے خواہ مخواہ لڑائی کریں بلکہ قرآن حکیم نے جا بجا مسلمانوں کو یہ سکھایا ہے کہ بنی آدم تمہارے بھائی ہیں اور ان سے محبت اور خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت کے خسران عظیم سے بچانے کے لیے حق ان تک پر امن طریقے سے، پیارا اور محبت سے پہنچاؤ تاکہ وہ آخرت میں عذاب سے اور دنیا میں فساد فی الارض سے بچ سکیں اور دونوں جہانوں میں امن و سکون و کامیابی کی زندگی گزاریں۔ تاہم، بلاشبہ، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مدافعت کا حکم بھی دیا ہے خصوصاً جب کوئی دشمن ان پر چڑھ دوڑے، ان پر ظلم کرے اور ان کی عزت و آبرو اور حفظ ناموس و وطن خطرے میں پڑ جائے (۱۳) اور ظاہر ہے اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کیوں کہ دنیا کا ہر قانون اور ضابطہ، یہاں تک کہ اہل مغرب کی قائم کردہ اقوام متحدہ بھی، افراد اور قوموں کو اپنی جان، مال، عزت اور وطن کی حفاظت کا حق دیتی ہے۔ علاوہ ازیں اسلام ان متعصب اور جاہر حکمرانوں کی طاقت توڑنے کی بھی حمایت کرتا ہے جو اپنی رعایا کو غیر جانبداری کے ماحول میں اسلام کو سمجھنے اور سمجھ کر قبول یا رد کرنے کا اختیار نہیں دیتے اور اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، بشرطیکہ مسلمان یہ کر سکنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ ظاہر ہے یہ بھی ایک شریفانہ اور مٹی بر انصاف موقف ہے کیونکہ اسلام کسی کو جبر سے مسلمان بنانے کی حمایت نہیں کرتا (۱۵) اور نہ مسلم تاریخ میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں نے کسی قوم کو طاقت اور دھونس سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگرچہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے مسلمانوں سے دشمنی کے بارے میں جو فرمایا ہے وہ سچ ہے اور وہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے تاہم جو چیز ہمارے اس ایمان کو پختہ کرتی ہے وہ ہمارا مشاہدہ و تجربہ ہے۔ انبیاء اور ان کی مخاطب قوموں سے کشمکش کے احوال، خود نبی کریم ﷺ سے ان کے مخالفوں کا طرز عمل، صلیبی جنگیں، پچھلی دو تین صدیوں میں غیر مسلموں کا مسلم ممالک پر قبضہ کرنا، انہیں قوت سے کچلنا، ان کے اموال لوٹ لینا، ان کے (اجتماعی زندگی) کے ادارے توڑ کر انہیں اپنے کافرانہ اصولوں پر استوار کرنا، پھر ہمارے دیکھتے عراق اور افغانستان کو تباہ کرنا، لیبیا میں مداخلت کرنا، نیز پاکستان، یمن اور مالی پر کفار کے حملے اب بھی جاری ہیں اور فلسطین، چین، کشمیر، کوہ قاف اور ترکستان میں مسلمانوں پر غیر مسلموں کے ظلم و ستم اس وقت بھی جاری ہیں۔ پاکستان کے اندر کراچی، بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے اسلام، مسلم اور پاکستان دشمن قوتوں کا فعال ہونا بالکل واضح ہے۔ غیر مسلموں کا مسلمانوں کی معیشت تباہ کرنے، ان

کے نظام تعلیم اور میڈیا کو اپنے

زیر اثر رکھنے، ان کی معاشرتی قدریں برباد کرنے اور سب سے بڑھ کر مسلم ممالک کے حکمرانوں کو اپنا گماشتہ بنا کر رکھنے جیسے کام ہمارے مشاہدے اور تجربے میں ہیں۔ چنانچہ قرآن و سنت نے تو ہماری اصولی رہنمائی فرمائی ہے کہ کفار تمہارے دشمن ہیں لیکن ہم تو کھلی آنکھوں ان کی اسلام اور مسلم دشمنی صاف دیکھ رہے ہیں لہذا اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش موجود نہیں کہ کفار مسلمانوں کے بدخواہ اور دشمن ہیں۔

۳۔ اہل کفر سے معاشرت کی مذمت

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

’من جامع المشرك و سكن معه فانه مثله‘ (۱۶)

یعنی جو مشرکوں کے ساتھ رہے اور ان کے ساتھ رہائش رکھے وہ انہی کی مانند ہے۔

نیز نبی کریم ﷺ نے ایسے مسلمانوں سے جو کفار کے ساتھ رہیں، اظہار برأت فرمایا اور کافر معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اگر وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں تو ان کی (پوری کی بجائے) آدھی دیت ادا کرنے کا حکم دیا:

”بعث رسول الله ﷺ سرية الى خثعم فاعتصم ناس منهم بالسجود فاسرع فيهم القتل. قال فبلغ ذلك النبي ﷺ فامر لهم بنصف العقل وقال ”انا برئ من كل مسلم يقيم بين اظهر المشركين“. قالوا يا رسول الله ﷺ لم؟ قال: ”لا تراني نارا هما“ (۱۷).

حضرت جریر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بنی خثعم کی طرف ایک سریہ بھیجا (جنگ شروع ہوئی) تو کچھ لوگوں نے سجدوں کے ذریعے جان بچانا چاہی (یعنی اپنے آپ کو مسلمان باور کرانے کی کوشش کی) لیکن مسلمانوں کے سپہ سالار نے (اس کے باوجود) جنگ تیز کر دی اور وہ لوگ قتل کر دیے۔ جب یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے علم میں آیا تو آپ ﷺ نے ان کی آدھی دیت ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکوں کے ساتھ رہے۔ لوگوں نے پوچھا ”وہ کیوں یا رسول اللہ ﷺ؟“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی یکجا معاشرت کی وجہ سے، ان میں باہم تمیز نہ کر سکنے کے سبب۔

انہی معنی میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”لا تستضيئوا بنار المشركين“ (۱۸)

یعنی غیر مسلموں کی آگ سے آگ نہ جلاؤ۔

مطلب یہ کہ ان سے معاشرتی تعلقات نہ رکھو، ان کے قریب نہ رہو۔ ان سے لینا دینا نہ رکھو، ان کی محتاجی سے بچو، اپنی ضروریات میں خود کفیل رہو.... وغیرہ اور امام حسن بصری سے اس حدیث کی یہ تشریح منقول ہے کہ اپنے امور میں ان سے مشاورت نہ کرو (۱۹)۔

۴۔ لزوم ہجرت (یعنی لزوم ترک معاشرت مع الکفار)

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مدینہ منورہ میں قیام دارالاسلام یعنی اسلامی ریاست کے قیام کے بعد عرب کے مسلمانوں پر دارالکفر سے مدینہ کی طرف ہجرت لازم کر دی اور دارالاسلام کی موجودگی میں دارالکفر میں رہنے سے منع کیا اور ہجرت کر کے دارالاسلام نہ جانے والوں کی مذمت کرتے ہوئے انہیں جہنم کی وعید سنائی:

”إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْتُمْ الْمَلَائِكَةَ ظَالِمِينَ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَ ثَمَرٌ لِّمَصِيرٍ“ [۹۷:۴]

”جو لوگ ہجرت نہ کر کے اپنے لیے برا کر رہے ہیں جب فرشتے ان کی جان قبض کریں گے تو ان سے پوچھیں گے تم کس حال میں تھے؟ وہ کہیں گے ہم اپنے ملک میں بے بس تھے؟ فرشتے کہیں گے کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم دوسری جگہ ہجرت کر جاتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

- اور جنہوں نے اس کے باوجود ہجرت نہیں کی اللہ تعالیٰ نے ان سے انقطاع ولایت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

”...وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَالَكُم مِّنْ وَلَا يَتَهُم مِّنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ

يُهَاجِرُوا....“ (الانفال ۸: ۷۲)

”وہ لوگ جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تو اے مسلمانو! ان سے تمہارا

رفاقت کا کوئی تعلق نہیں جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں“

چنانچہ بہت سے علماء نے کہا ہے کہ اس سے مقصود قطع ولایت ہے، محض وراثت نہیں، بسبب ہجرت

نہ کرنے والوں سے صدور فسق کے (۲۰)

- اور رسول کریم ﷺ نے ان کے ایمان کو غیر معتبر قرار دیتے ہوئے ان سے اظہار برأت فرمایا:

”انا برئ من کل مسلم یقیم بین اظهر المشرکین، قالوا یا رسول اللہ لم؟ قال:

لا ترانی ناراهما“ (۲۱).

- اور اگرچہ فتح مکہ کے بعد مدینہ کی طرف جسمانی ہجرت تو فرض نہ رہی (۲۲) لیکن جمہور علماء کے نزدیک ایسی جگہ سے ہجرت کر کے جہاں ایک مسلمان اسلامی احکام کے مطابق آزادانہ زندگی بسر نہ کر سکے، کسی دوسری ایسی جگہ جانا جہاں وہ اسلامی حکام پر آزادانہ عمل کر سکے اور اسلامی زندگی بسر کر سکے، آج بھی ضروری ہے۔ یہی رائے متقدمین اور متاخرین فقہاء کی ہے۔ عصر حاضر میں عالم عرب سے، سعودی عرب کی مرکزی مجلس افتاء نے اس پر (بشرط استطاعت) اجماع امت کا ذکر کیا ہے (۲۳) اور برصغیر کے علماء میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی، (۲۴) مولانا بدر عالم میرٹھی، (۲۵) مولانا عبدالحق حقانی (۲۶) اور مولانا عبدالقدیر صدیقی (۲۷) نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

قرآن و سنت کی ان نصوص کی روشنی میں متقدمین اور متاخرین فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم معاشرے یعنی دار الکفر میں جا کر رہنا صحیح نہیں (خواہ وہ مسلمانوں سے معاہدے کے نتیجے میں دارالصلح ہو یا ان کے معاندانہ رویے کی وجہ سے دارالحرب ہو) کیونکہ وہاں اسلامی احکام پر آزادانہ عمل اور اسلامی زندگی گزارنے کی آزادی میسر نہیں ہوتی جو دراصل دین کا مقصود اعظم ہے چنانچہ امام خطابی سطور بالا میں ذکر کردہ حدیث جبریر کی تشریح میں کہتے ہیں:

”اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دارالاسلام اور دارالکفر کو علیحدہ علیحدہ

کر دیا ہے لہذا کسی مسلمان کے لیے کافروں کے وطن میں ان کے ساتھ رہائش

اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔“ (۲۸)

۵۔ دارالکفر میں عارضی قیام کی اباحت

قرآن و سنت کے مذکورہ بالا احکام سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت مسلمانوں کے دارالکفر سے دارالاسلام ہجرت کی حامی ہے اور مسلمانوں کا دارالکفر میں رہنا اس کے نزدیک ناپسندیدہ اور غیر مطلوب ہے۔ تاہم اس اصول سے بطور استثناء اور مشروط طور پر کچھ چیزوں کو الگ کیا جاسکتا ہے جیسے بعض ٹھوس مصالح کی خاطر دارالکفر میں عارضی قیام مثلاً:

۱۔ بغرض تبلیغ و اشاعت دین (بشرطیکہ اپنے دین و ایمان کو خطرہ نہ ہو اور کفار سے متاثر نہ ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو بلکہ یقین و اثق ہو کہ ان کو دین کی طرف راغب کر سکے گا)۔

۲۔ تجارت (جیسا کہ امام خطابی کا قول ہے کہ: ”اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دارالکفر جائے تو اس کے لیے وہاں ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے“۔ (۲۹)

۳۔ سفارت

۴۔ کسی غیر صالح مسلمان حکمران کے جبر و ظلم سے تنگ آکر کسی کافر ملک میں پناہ لینا (بشرطیکہ کسی مسلمان ملک میں پناہ نہ مل سکتی ہو) (۳۰)۔

۵۔ برائے علاج (مثلاً حالت اضطراب میں جان بچانے کے لیے ایسا آپریشن جو کسی مسلم ملک میں نہ ہو سکتا ہو)

۶۔ برائے تعلیم (صرف ایسی مہارتوں اور علوم کے لیے جو مسلم ممالک میں موجود نہ ہوں لیکن مسلم معاشرے کے لیے ناگزیر ہوں)

ظاہر ہے دارالکفر میں عارضی قیام کسی مسلم فرد یا معاشرے کے حقیقی مصالح سے مشروط ہے اور اس کی حیثیت اصل ”حکم شرعی“ سے جو عدم جواز کا ہے، محض استثناء کی ہے لہذا ان استثناءات کا غلط استعمال ناقابل قبول بلکہ قابل مذمت ہے۔ اصل یہ ہے کہ مستقل طور پر دارالکفر میں رہنا ایک مسلمان کے ایمان و عمل کے لیے خطرناک ہے چنانچہ علماء کرام اگر کسی کو دارالکفر میں رہنے کی اجازت دیتے ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ ”وہاں جا کر دین و ایمان کے تحفظ، احکام دین پر عمل اور کسی حرام کے اندر مبتلا نہ ہونے کا یقین ہو“ (۳۱) چنانچہ سعودی دارالافتاء کے مفتیوں نے علماء کے لیے بغرض تبلیغ وہاں جانے پر بھی یہ پابندی لگائی ہے کہ ”اذا لم یخش الفتنہ فی دینہ و کان یرجو التأثير فیہم و ہدایتہم“ (۳۲) یعنی بشرطیکہ اسے اپنے دین میں فتنے کا اندیشہ نہ ہو اور غیر مسلموں پر اثر انداز ہونے اور ان کے ہدایت پانے کی قوی امید ہو۔

اسی لیے شریعت نے مسلمانوں کو التزام جماعت کا حکم دیا ہے یعنی مسلم معاشرے اور ریاست میں رہنے کو لازمی قرار دیا ہے اور اس پر عمل نہ کرنے والے کو ”مات میتة جاہلیة“ (۳۳) (یعنی جسے اس حالت میں موت آئی گویا وہ جاہلیت کی موت مرا) قرار دیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے کسی غیر مسلم معاشرے میں جا کر مستقل رہنے کا عمومی فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں لبتہ اگر کسی کا ایمان مضبوط اور عمل مستحکم

ہو اور اسے یقین ہو کہ وہ کافر معاشرے سے متاثر ہونے کی بجائے اسے متاثر کر سکتا ہے تو وہ انفرادی طور پر خطرہ مول لے کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ بغرض اشاعت دین کسی غیر مسلم معاشرے میں جا کر رہے جس طرح کہ مسلمان صوفیاء، علماء اور تاجروں نے ہندوستان، انڈونیشیا، ملائیشیا، فلپین۔۔۔ وغیرہ میں اسلام کی کامیاب اشاعت کی۔

۶۔ بعض مغالطوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ

یہ ایک حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی لحدانہ فکر و تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اس تہذیب کے علم بردار ممالک امریکہ، یورپ، آسٹریلیا، جاپان۔۔۔ وغیرہ دنیاوی لحاظ سے خوش حال ہیں۔ دوسری طرف مسلمان اور ان کی تہذیب مغلوب ہے اور مسلم ممالک کی اکثریت غربت و افلاس میں مبتلا ہے لہذا مسلم ممالک کے کئی مسلمان شہری زیادہ پیسے کمانے کے لالچ میں، معیار زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں اور دنیاوی سہولتیں (فرق، ٹی وی، کار، بگلہ، بنک بیلنس۔۔۔ وغیرہ) حاصل کرنے کے لیے غیر مسلم ممالک میں جاتے ہیں اور وہاں کی غیر مسلم تہذیب سے مرعوب و متاثر ہو کر اس معاشرے میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں اور دین و ایمان سے جاتے ہیں اور اگر ان میں کچھ دین و ایمان کے اثرات باقی رہیں بھی تو ان کی آنے والی نسلیں بہر حال مسلمان نہیں رہتیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں مسلمانوں کو دولت کمانے اور دین گنوانے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی۔

بعض لوگ اس دلیل کو رد کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو بیرون ملک کام کرتے ہیں وہ مسلم ممالک کو قیمتی زر مبادلہ بھجواتے ہیں لہذا ان کی بیرون ملک سکونت کو غیر شرعی قرار دینا صحیح نہیں ہے اور اس طرح کا فتویٰ دینا ملکی معیشت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ہماری رائے میں اس بات میں زیادہ وزن نہیں ہے خصوصاً اگر مندرجہ ذیل امور سامنے رکھے جائیں:

- مسلم ممالک خصوصاً پاکستان میں معیشت کی بد حالی کی وجہ وسائل کی کمی نہیں بلکہ مسلم حکمرانوں کی کرپشن، شاہ خرچیاں اور بدعنوانیاں ہیں اور اس کرپشن اور بدعنوانی کو مغربی ممالک اور ان کے مالی اداروں نے اسلام اور مسلم دشمنی میں عمداً بلکہ منصوبہ بندی سے مسلم ممالک میں فروغ دیا ہے اور وہ آمروں اور کرپٹ حکمرانوں کو اپنا ایجنٹ بنا کر حکومت میں لاتے اور ان کے اقتدار کو طول دیتے ہیں۔

- غیر مسلم خصوصاً مغربی ممالک آج بھی تجارت کو اپنے یعنی غیر مسلم ممالک کے اندر محدود رکھتے اور فروغ دیتے ہیں اور مسلم ممالک سے تجارت کر کے ان کو مالی فائدہ نہیں پہنچنے دیتے۔

- مغربی ممالک مسلمان پروفیشنلز (ڈاکٹروں، انجینئروں، سائنس دانوں، پروفیسروں) کو زیادہ تنخواہ اور سہولتوں کا لالچ دے کر ان کی خدمات سے اپنے معاشرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور مسلم ممالک کو ان کی خدمات سے محروم کر دیتے ہیں حالانکہ مسلم ممالک کا کثیر سرمایہ ان افراد کی تعلیم و تربیت پر خرچ ہوتا ہے۔

- پاکستان مسلم ممالک سے معاہدے کر کے اپنی لیبر فورس دوسرے مسلم ممالک کو بھجوا سکتا ہے اور ان سے تجارت کو فروغ دے سکتا ہے تاکہ ہماری لیبر مسلم ممالک میں رہے اور دونوں مسلم ممالک کو لیبر کے تبادلے اور تجارت سے مالی فائدہ بھی ہو۔

- مسلم ممالک کی طرف سے مغربی ممالک کو لیبر فورس مہیا کرنے کا کام ریاستی سطح پر کیا جائے اور ان سے شرائط کارمنوائی جائیں جیسے باجماعت نماز کی اجازت، اسلامی تہواروں پر چھٹی کی اجازت وغیرہ اور اسے افراد پر نہ چھوڑا جائے کہ وہ خود وہاں جا کر ملازمت تلاش کریں۔

- یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں جو زرمبادلہ آ رہا ہے۔ وہ زیادہ تر مسلم ممالک سے آ رہا ہے مغربی ممالک چونکہ دور ہیں اور وہاں شہریت یا پزٹنس اور دیگر سہولتیں زیادہ ہیں لہذا جو پاکستانی پروفیشنلز وہاں جاتے ہیں وہ وہاں شادی کر لیتے ہیں یا پاکستان سے اپنی فیملی وہاں بلا لیتے ہیں اور یوں ان کے پیسے وہیں خرچ ہو جاتے ہیں اور وہ کوئی خاص زرمبادلہ پاکستان نہیں بھجوا پاتے۔

- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو مسلمان مغربی ممالک میں معیار زندگی بلند کرنے جاتے ہیں اور وہاں مستقل رہائش اختیار کر لیتے ہیں ان کی بہت بڑی اکثریت (اندازاً ۸۰ تا ۹۰ فی صد) وہاں کے غیر اسلامی ماحول میں جذب ہو جاتے ہیں اور اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے، نہیں کر پاتے اور خصوصاً ان کی آئندہ نسلوں کے اچھا عملی مسلمان بننے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کے قول کے مصداق وہ ان یہودیوں عیسائیوں کے ساتھ رہتے ہوئے ان جیسے ہی ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ہر لحاظ سے خسارے کا سودا ہے اور اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ تھا مسلمانوں کے غیر مسلم ممالک میں جا کر رہنے کی شرعی حیثیت کے حوالے سے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے سوائے بعض استثنائی امور کے جن میں بعض حقیقی مصالح کی خاطر عارضی طور پر دارالکفر میں قیام کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ دین و ایمان کو خطرہ نہ ہو۔ اب ہم مستفتی کے اصل سوال کی طرف آتے ہیں کہ کسی مسلمان کے لیے غیر مسلم مغربی ممالک کی شہریت اختیار کرنا اور اس کا حلف اٹھانا شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟ (جاری ہے)

حواشی

- (۱) صحیح مسلم، الطہارۃ ۵۶
- (۲) سنن ابی داؤد، لباس ۴
- (۳) مسند احمد بن حنبل، ج ۶ ص ۳۲۴
- (۴) صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم عاشورا
- (۵) البقرہ ۲: ۱۴۴، ۱۴۵
- (۶) مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۶۴
- (۷) البقرہ ۲: ۱۹۸، ۱۹۹
- (۸) التوبہ ۹: ۳۷
- (۹) التکویر: ۸۱: ۸۹
- (۱۰) النساء: ۴: ۲۲
- (۱۱) صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء باب ما ذکر عن بنی اسرائیل
- (۱۲) صحیح مسلم، الحيض باب جواز غسل الحائض حدیث رقم ۳۰۲
- (۱۳) Encyclopedia of Islam, Vol. 10, P-122, Leiden, 2000
- (۱۴) النساء ۴: ۷۵
- (۱۵) البقرہ ۲: ۲۵۶
- (۱۶) سنن ابی داؤد، باب الاقامہ فی ارض الشریک
- (۱۷) الطبرانی، المعجم الکبیر، جلد دوم
- (۱۸) سنن نسائی، کتاب الزینۃ، باب لا تنقشوا علی خواتیمکم عربیاً
- (۱۹) امام ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۱، ص ۳۹۸، تہذیب الکتب لاہور ۱۹۷۲ء
- (۲۰) دیکھیے مثلاً مولانا ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج ۴، ص ۱۱۵
- (۲۱) الطبرانی، المعجم الکبیر، جلد دوم
- (۲۲) صحیح بخاری، باب فضل الجہاد و السیر

- (۲۳) سعودی دارالافتاء، فتویٰ ۲۳۹۳، سوال نمبر ۶
- (۲۴) تفسیر عثمانی
- (۲۵) ترجمان السنۃ، باب نہی عن المنکر تکثیر سواد المشرکین، ج ۲ ص ۳۷۱
- (۲۶) تفسیر حقانی، ج ۲ ص ۴۸۰ مکتبہ خیر کثیر کراچی
- (۲۷) تفسیر صدیقی، ج ۲ ص ۳۱۱، ادارہ اشاعت تفسیر صدیقی کراچی
- (۲۸) معالم السنن للخطابی، ج ۳ ص ۴۳۷
- (۲۹) نفس المرجع
- (۳۰) جیسے مصر میں مسلم حکمرانوں سے جان بچا کر محمد قطب سعودی عرب آگئے یا شیخ یوسف القرضاوی قطر چلے گئے یا فلسطینی اور افغان مسلمان ہمسایہ ملکوں میں ہجرت کر گئے۔
- (۳۱) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، ج ۱
- (۳۲) فتویٰ سعودی دار الافتاء
- (۳۳) صحیح بخاری، فتن ۲

اصل جنگ

سکندر اعظم کی ملاقات ایک جنگ کے دوران ایک فقیر (درویش) سے ہوئی۔
 فقیر: یہ جنگ جیتنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟
 سکندر: ایک جنگ اور لڑوں گا۔
 فقیر: اس کے بعد؟
 سکندر: پھر ایک جنگ اور لڑوں گا۔
 فقیر: آپ پوری دنیا فتح کر لو اس کے بعد؟
 سکندر: پھر آرام سے زندگی گزاروں گا۔
 فقیر: وہ تو میں بنا جنگ لڑے بھی گزار رہا ہوں..... بس ایک جنگ لڑی تھی اپنے
 نفس کے خلاف۔
 (ایم اے خان)

ذکر انسانی شخصیت کو بدل دیتا ہے

ذکر سے مراد ہے اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا۔ یہ مشروع اور منصوص ہے یعنی حکم قرآن و سنت ہے۔ لہذا جو لوگ کثرت ذکر کو صوفیوں کی اختراع سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ کثرت ذکر بلکہ دائمی ذکر سنت رسول ﷺ ہے اور ظاہر ہے دین نام ہی اتباع سنت کا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں حصول رضائے الہی کا انحصار اتباع سنت ہی پر ہے اور سنت یہ ہے کہ ذکر اللہ کثرت سے کیا جائے۔

جدید نفسیات بھی اس اصول کی تائید کرتی ہے کہ آپ جو کرنا اور بننا چاہتے ہیں اس کا اظہار بار بار اپنی زبان سے کریں، خود کو اس کی ترغیب دیں یہاں تک کہ وہ خیال آپ کے دل و دماغ میں جم جائے اور آپ کی شخصیت اس کے مطابق ڈھل جائے۔

تحقق صوفیاء کے نزدیک ذکر کی تین سطحیں ہیں: قال، خیال اور حال۔ قال ہے زبان سے ذکر کرنا۔ جب زبان سے ذکر کثرت سے اور توجہ سے کیا جاتا ہے تو وہ دل و دماغ میں رچ بس جاتا ہے اس کے نتیجے میں اللہ کا استحضار نصیب ہو جاتا ہے کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے ترک معصیت کی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ذکر حال بن جائے یعنی اعضاء و جوارح اس ذکر کے تقاضوں کے مطابق عملاً حرکت میں آنے لگیں۔ اصل مطلوب یہی ہے کہ ذکر قال نہ رہے حال بن جائے لیکن قال ہوگا تو حال بننے کا لہذا ذکر سے غفلت روا نہیں۔ ذکر کیجیے اور کثرت و توجہ سے کیجیے کہ دل و دماغ میں پختہ ہو جائے۔

اگر روزانہ دن میں کسی کو سو بار پاگل کہو تو وہ سچ پاگل ہو جائے گا تو اگر سو بار دن میں اللہ اکبر کہو تو اللہ کی کبریائی اور اپنے پیچھے ہونے کا تصور دل و دماغ میں کیوں نہیں جمے گا؟ اور اللہ کے احکام کی اتباع اور فرمانبرداری کا رجحان کیوں ترقی نہیں کرے گا؟ لہذا کثرت ذکر کو معمول بنانا ضروری ہے۔ اللہ کا ذکر کیجیے، کثرت سے کیجیے، توجہ سے کیجیے تاکہ قال، خیال اور حال بن جائے اور آدمی اللہ کا بندہ بن جائے۔

قارئین البرہان کے نام

✉ جن اصحاب نے ایک دفعہ سالانہ چندہ بھجوا یا جو ختم ہو گیا لیکن پرچہ اب بھی ان کو مل رہا ہے۔ وہ اگلے سال کے لیے زراعت بھجوادیں یا ہو سکے تو تاحیات خریدار بن جائیں۔

▢ اگر آپ کے پاس پرچہ اعزازی آتا ہے اور آپ کو پسند ہے اور آپ مالی وسعت رکھتے ہیں تو ۴۰۰ روپے سالانہ زراعت اس زمانے میں کوئی بڑی بات نہیں، بھجوادیں تاکہ انتظامیہ پر مالی بوجھ کم ہو۔

▢ اگر آپ خوشحال ہیں اور پرچہ آپ کو پسند ہے تو ۵۰۰ روپے بھجوا کر تاحیات خریدار بن جائیں۔ اگر آپ کاروبار، تجارت یا مارکنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں تو البرہان کو اشتہار دیکھنے یا دلوائیے۔

▢ اگر پرچہ آپ کو اعزازی طور پر ملتا ہے اور آپ کی دلچسپی اور پسند کا نہیں تو ازراہ نوازش خط، SMS، ای میل یا فون کے ذریعے مطلع فرمادیں تاکہ اس کی ترسیل بند کر دی جائے۔

▢ اگر آپ مالی طور پر کمزور ہیں لیکن البرہان پڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مطلع کیجیے، ہم پرچہ آپ کے نام جاری کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ ۴۰۰ روپے سالانہ ادا کر سکتے ہیں تو پرچہ فری نہ منگوائیے، خرید کر پڑھیے۔

ۛ البرہان کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیے، خود خرید کر پڑھیے، دوسروں کو خریدنے کی ترغیب دیجیے، دوسروں کو خرید کر دیجیے۔ اس کی ایجنسی لیجیے۔ اس کے تاحیات خریدار بنیے۔

✉ مدیر البرہان کی کتابیں بلا معاوضہ مانگ کر شرمندہ نہ کیجیے۔ تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ اتنی مالی سکت نہیں رکھتا کہ کتابیں طبع اور تقسیم کرے۔ ہم قارئین کی سہولت اور اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے صرف اتنا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی جو کتابیں مختلف پبلشرز نے طبع کی ہیں، وہ خرید کر طلب کرنے والوں کو بھجوا دیتے ہیں۔ اگر آپ کو ٹرسٹ کے مقاصد سے دلچسپی ہے تو کتابوں کی طباعت و تقسیم میں ادارے سے مالی تعاون فرمائیے۔

عبدالحمید

(سرکولیشن مینیجر)

تنظیم اسلامی کا منہج اور چند مغالطے

ماہنامہ البرہان بابت ماہ دسمبر ۲۰۱۳ء میں جناب محمد رشید صاحب کا ایک مضمون ”غلبہ اسلام بذریعہ احتجاجی سیاست- تنظیم اسلامی کی خدمت میں چند گزارشات“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس مضمون میں تنظیم کے فکر و طریق پر کچھ نقد فرمایا گیا ہے۔ یہ تنقید امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید صاحب کے اس خطاب کی روشنی میں کی گئی ہے جو انہوں نے ”پاکستان میں اس کے قیام سے اب تک، احیائے اسلام کی کوششوں کا جائزہ“ کے عنوان سے سیمینار (منعقدہ ۲۱ جون ۲۰۱۳ء بمقام کراچی) میں ارشاد فرمایا تھا۔ یہ خطاب بعد میں ماہنامہ میثاق کی اشاعت بابت اکتوبر ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ صاحب مضمون نے تنظیم اسلامی کے فکر و طریق پر جو اعتراضات وارد فرمائے ہیں اس حوالے سے چند وضاحتیں ذیل میں تحریر کی جا رہی ہیں:

پہلا اعتراض:

صاحب مضمون لکھتے ہیں:

تنظیم اسلامی کے امیر محترم حافظ عاکف سعید صاحب اپنے خطاب بعنوان ”پاکستان میں اس کے قیام سے اب تک احیائے اسلام کی کوششوں کا جائزہ“ (منعقدہ ۲۱ جون ۲۰۱۳ء بمقام کراچی، شائع شدہ ماہنامہ میثاق بابت اکتوبر ۲۰۱۳ء) میں مولانا مودودی مرحوم کی ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہونے والی ایک نہایت اہم تحریر کا حوالہ دیتے ہیں، جس میں مولانا مرحوم نے فرمایا کہ:

”واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔“

اس کے بعد سید مودودی مرحوم پہلے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے ”انتخابات“ کو ایک عارضی اور آزمائشی طریقہ کے طور پر ذکر کرنے کے بعد دوسرے طریقے کی تفصیل ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

”دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی جنگلی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔“

اس کے بعد مولانا نے تحریر فرمایا کہ ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزمارہے ہیں۔ اگر اس میں ناکام ہوئے تو ہم دوسرے طریقے کی طرف لوٹ جائیں گے۔ جناب عاکف سعید صاحب نے اس تحریر کا حوالہ

دینے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ:

”اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بہر حال یہ دو طریقے ہیں اور قیام پاکستان کے بعد جس طریقہ کار (یعنی انتخابات کے ذریعے نفاذ شریعت) کو اختیار کیا گیا وہ وقتی طور پر تھا بایں طور کہ اگر کامیابی نہیں ملتی تو ہم پھر واپس پہلے طریقے (یعنی انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذ شریعت) کی طرف لوٹ جائیں گے۔“

حیرت کی بات یہ ہے کہ سید مودودی مرحوم و مغفور غلبہ اسلام کے جس طریقے کو اپنی تحریر میں بغیر کسی رنگ آمیزی کے دین کی خالص اور سادہ اصطلاح کی ترجمانی کرتے ہوئے ”عمومی تحریک اصلاح“ کے واضح عنوان سے ذکر فرما رہے ہیں جناب عاکف سعید صاحب سید مودودی مرحوم کی تحریر کے مندرجات درج کرنے کے باوجود اس دوسرے طریقے کو اصل کا نام دینے سے کترا جاتے ہیں اور مولانا مودودی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس طریقے کو ”انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذ شریعت“ کے نام سے بدل دیتے ہیں۔“

جواب:

صاحب مضمون کا اعتراض یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے جس طریق کار کو ”اصلاحی“ کہا تھا جناب عاکف سعید صاحب نے اُسے ”انقلابی“ کے نام سے موسوم کر دیا۔ اس اعتراض پر تبصرہ سے پہلے مناسب ہوگا کہ مولانا مودودیؒ کی وہ پوری تحریر نظر سے گزار لی جائے جس کے صرف ایک اقتباس کا حوالہ جناب عاکف سعید صاحب نے دیا ہے۔ دراصل مولانا مودودیؒ کی تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ اُن سے پوچھا گیا تھا کہ آپ اسلامی حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تاکہ اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کر کے منظور کرایا جائے؟ مولانا یوں جواب دیتے ہیں:

”ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو نہ اخلاق اسلامی ہوں، جہاں کا سیاسی و معاشی و تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہو، اور جہاں مجرد ایک سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی یکا یک نوبت آگئی ہو۔ وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی بات پر اٹکا ہو کہ ہم دستور مرتب کر کے پیش کریں اور برسر اقتدار لوگ اسے لے کر نافذ کریں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ گمان کرے کہ ایک مدرسے یا ایک بینک کو ہسپتال بنا دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر مل کر ایک اچھے ہسپتال کا خاکہ مرتب کر دیں اور وہ مدرسے کے معلمین یا بینک کے اسٹاف کو دے دیا جائے تاکہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر سارا کام کرتے چلے جائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سادگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔ شاید

دستور کو انہوں نے کوئی تعویذ سمجھا ہے۔

واضح طور سمجھ لیجیے یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے: ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص اور اپنے وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمان داری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہوں۔ (جنہیں ہم نے اپنے مطالبے میں بیان کر دیا ہے) پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے، پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں اور وہ حکومت کی طاقت و ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لا حاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آ گیا لیکن خدا نخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہو گا جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطہ نظر سے ہم اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے، جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔“

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء، رسائل و مسائل زیر عنوان، قیام نظام اسلامی کی صحیح ترتیب)

تقسیم سے پہلے کا طریقہ، جسے مندرجہ بالا مضمون میں مولانا مودودیؒ نے ’دوسرا طریقہ‘ اور عمومی تحریک اصلاح‘ سے معنون کیا ہے، الفاظ کے پیرائے میں یوں بیان ہوا ہے ”دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پہچان کو پہچنے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔“ اس طریقے کو جناب حافظ عاکف سعید صاحب نے انقلابی طریقہ قرار دے کر صاحب مضمون کی رائے کے مطابق مولانا مودودیؒ کے موقف کی غلط تعبیر کی ہے۔ صاحب مضمون محمد رشید صاحب کے اس الزام کو پرکھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ مولانا کی قبل تقسیم کی تحریروں کی طرف رجوع کیا جائے جن میں اس ”دوسرے طریقے“ کی پوری تفصیلات موجود ہیں، جس کا ذکر مولانا کے مذکورہ بالا اقتباس میں مختصر اُصروف دوسطروں میں کیا گیا ہے۔ اور انہی دوسطروں کی بنیاد پر رشید صاحب مولانا کے قبل از تقسیم طریق کار کو ’اصلاحی‘ قرار دینے پر بضد ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ مولانا مودودیؒ اپنی، قیام پاکستان سے قبل کی عمومی تحریک اصلاح کو ’انقلابی تحریک‘ ہی سمجھتے تھے۔ اس کے لیے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا سرسری سا جائزہ لینا ہی کافی ہے۔ مثلاً مولانا مودودیؒ اپنی کتاب ’جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ، اور لائحہ عمل‘، اشاعت اول نومبر ۱۹۵۱ء میں زیر عنوان ’متحدہ ہندوستان میں ہمارا موقف‘ قبل از تقسیم کی اپنی جدوجہد کے بارے میں لکھتے ہیں:

” (متحدہ ہندوستان) میں انتخابات میں حصہ لینا ہمارے لیے شرعاً صحیح نہ تھا۔ اس لیے ہم نے اس زمانے میں پرامن، غیر خفیہ، انقلابی دعوت کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔“

تبلیغی جماعت کے طریقہ تبلیغ اختیار کرنے کی تجویز کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں:

”جس قسم کا کلی انقلاب ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے وہ طریقہ کچھ بھی مدگار نہیں ہو سکتا۔“ (روداد جماعت اسلامی، حصہ سوم، صفحہ ۱۶۲)

اسلامی حکومت کے قیام کے طریق کار کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا موقف پہلی بار ”اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے“ کے موضوع پر ان کی تقریر کے ذریعہ ۱۹۳۹ء میں سامنے آتا ہے۔ اس تحریر میں مولانا باقاعدہ ’اسلامی انقلاب کی سبیل‘ کی سرخی لگا کر اسلامی انقلاب کے منہج کو یوں واضح کرتے ہیں:

”درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف

وہی لوگ ہوں جو اس خاص سانچے کی انسانیت میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اٹھے جو اسی مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس آئندہ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی سیادت (intellectual leadership) کا سکہ جمادیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش میں پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں دے کر، مارکھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا ہر طرح سے جانچ کر بے کھوٹ کامل المعیار (Finest Standard) سونا ہی پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں۔ اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ ایسے بے لوث، بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اس میں ضرور انسان کیلئے عدل اور امن ہوگا۔ اسی طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے اس تحریک میں کھینچ آئیں گے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی، اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائے گا، جس کے لئے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو۔ اور جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہل کاروں سے لے کر وزراء اور نظماہ تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں۔ یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ (تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ دوم صفحہ ۱۷۰، ۱۷۱)

اب ملاحظہ فرمائیں وہ الفاظ جو امیر تنظیم اسلامی نے مولانا کے پیش کردہ طریقے کے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں:

”یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے جو انقلابی راستہ تجویز کیا اپنے خطاب ”اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے“ میں بھی اور قیام پاکستان سے پہلے عملی نیچ کے ذریعے بھی، اس جدوجہد کے آخری مراحل کے خدوخال زیادہ واضح نہیں کیے تھے۔ انقلابی نیچ کے ابتدائی مراحل وضاحت سے بیان فرمائے، یعنی قرآن کے ذریعے افراد کے قلوب میں حقیقی ایمان کی ترویج و آبیاری کرنا، افراد کے ذہن و قلب میں انقلاب برپا کرنا اور ایک مضبوط ڈسپلن والی جماعت تیار کرنا، لوگوں کے اندر دین کا جذبہ اور نفاذ شریعت کی شدید پیاس اور تڑپ دل میں پیدا کرنا وغیرہ۔ ابتدائی طریقہ کار تو انہوں نے بڑی عمدگی سے بیان کیا لیکن آخری مراحل کو پورے طور پر واضح نہ کیا۔ اب یہ مصلحت بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کا ذہن پوری طرح واضح نہ ہو۔“ (بیثاق اکتوبر ۲۰۱۳ء صفحہ ۳۲)

مولانا مودودیؒ کے الفاظ ”اسلامی انقلاب کی سبیل“ کو ”انقلابی راستہ“ کہنے اور ”انقلاب کے ظہور کا فطری طریقہ“ کو ”انقلابی منہج“ قرار دینے میں آخر، عربی اردو کے علاوہ فرق ہی کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ زیر بحث اقتباس میں مولانا علیہ الرحمہ نے لفظ اصلاح ہی استعمال کیا ہے۔ البتہ دیکھنا چاہیے کہ ان کے نزدیک اصلاح کا مفہوم کیا ہے؟ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ حافظ عاکف سعید صاحب کے انقلاب اور مولانا مودودیؒ کے تصور اصلاح میں کوئی مماثلت ہے یا نہیں؟ اور اگر مماثلت موجود ہو تو پھر مولانا کے لفظ اصلاح کو انقلاب سے تعبیر کرنے میں کوئی حرج باقی نہیں رہ جاتا۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

”یہ جماعت ان محدود معنوں میں کوئی سیاسی، مذہبی یا اصلاحی جماعت نہیں ہے جن میں عام طور پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں بلکہ یہ وسیع معنوں میں ایک اصولی جماعت ہے جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور عالم گیر نظریہ حیات پر یقین رکھتی ہے اور اپنے اس نظریہ کو عقائد و افکار میں، اخلاق و عبادات میں علوم و فنون، ادب و آرٹ میں تمدن و تہذیب میں، مذہب و معاشرت میں معاشی معاملات، سیاست اور نظام مملکت میں اور بین الاقوامی تعلقات اور روابط میں عملاً نافذ کرنا چاہتی ہے۔“ (تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، صفحہ ۴۰)

کچھ آگے بڑھ کر مولانا تحریر فرماتے ہیں:

”ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی انفرادی و اجتماعی میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے۔“ (ایضاً صفحہ ۴۳)

”مسلمان نام ہے ہی اس بین الاقوامی اصلاحی و انقلابی پارٹی کا نام جو اسلام کے نظریہ و مسلک کے

مطابق انسانی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے اس میدان میں قدم رکھے۔

(روداد جماعت اسلامی حصہ چہارم، صفحہ ۳۴)

مولانا دین بیز اراقلیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

’درحقیقت اقامت دین کی راہ کا روڑا یہی عنصر ہے۔ اسکو ہٹانا، عوام الناس کو اس کے اثر اور دباؤ سے

نکالنا اور اقتدار کی مسندوں سے اس کو بے دخل کرنا ایک ایسا ناگزیر و تخریبی کام ہے جس کے بغیر کوئی

تعمیری و اصلاحی کام بار آور نہیں ہو سکتا۔ (جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ، اور لائحہ عمل صفحہ ۹۹)

اپنے پیش نظر کام کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

”جو کام جماعت کے پیش نظر ہے وہ کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں ہے۔ اسے دنیا کے پورے نظام زندگی

کو بدلنا ہے، اسے دنیا کے اخلاق، سیاست، تمدن، معیشت، معاشرت، ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے۔ دنیا میں

جو نظام حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے۔ اور اس کام میں

تمام شیطانی طاقتوں سے اس کی جنگ ہے۔“

(روداد جماعت اسلامی، حصہ اول، صفحہ ۱۶)

’اقامت دین میں دین سے مراد اجزائے دین میں سے کوئی جزو مراد نہیں ہے خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ

ہو بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے، اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی، عقائد بھی اور اعمال

بھی۔ (روداد جماعت اسلامی، حصہ سوم، صفحہ ۱۹۴)

”ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے یعنی دنیا میں ہم جس آخری منزل تک پہنچنا چاہتے

ہیں وہ یہ ہے کہ فساق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو اور اسی سعی و جہد کو ہم

دنیا اور آخرت میں رضائے الہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ دراصل فساق و فجار کی قیادت

ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس پر ہے کہ دنیا کے

معاملات کی سہراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔۔۔۔۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح

چاہتا ہو اور فساد کو صلاح سے، اضطراب کو امن سے، بد اخلاقیوں کو اخلاق صالحہ سے، اور برائیوں کو

بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق

کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوع انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں

ملا کروہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھیننی جاسکے اور امامت کے نظام

میں تغیر کیا جاسکے۔ (روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۰۸، ۲۰۹ زیر عنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عقائد و اخلاق اور اعمال، معاشرہ و تمدن کے ساتھ ساتھ

قانون اور حکومت کی اصلاح بھی مولانا کے منصوبے میں شامل ہے اور ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے لیے تبدیلی قیادت بھی ناگزیر ہے۔ اور اس منصوبے کے لیے وہ انقلاب کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی کئی تحریریں اور خطابات شاہد ہیں کہ اُن کے نزدیک اسلامی انقلاب صرف حکومتی ڈھانچے کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ ذاتی اور انفرادی زندگی میں انقلاب یا اصلاح بھی اُن کے پیش نظر ہے۔ نیز مولانا مودودی کی مندرجہ بالا عبارات سے تقابل کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ چاہے انقلاب کا استعمال ہو یا اصلاح کا، تصورات و نوں خادمین دین کا ایک ہی ہے۔

دوسرا اعتراض:

جناب محمد رشید صاحب لفظ انقلاب کے استعمال پر ان الفاظ میں تنقید کرتے ہیں:

”واضح رہے کہ تحریک اصلاح کا عنوان تو جہات کو انفرادی و اجتماعی اصلاح پر مرکوز کرانے پر زور دیتا ہے جبکہ ”انقلابی تحریک“ کا لفظ تو جہات کو اصلاح کے اہم ترین فریضہ سے ہٹا کر باتوں کا تیس مار خاں اور مستقبل کے خیالی نقشے کی بحث و تجویز میں گم کر دیتا ہے۔ اصلاح کے لفظ سے عاجزی، انکساری، عبدیت اور انسانی ہمدردی و غنوغاری کی جھلک نمایاں ہوتی ہے جبکہ انقلاب کے لفظ سے ہی غرور، تکبر، نخوت، خون خرابہ، تباہی اور بربادی کے پیغام نشر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام عبدیت، تقویٰ اور اصلاح کا نعرہ بلند کیا کرتے تھے جبکہ جدید دنیا کا ہر ظالم اور آمر انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے۔ چنانچہ دین کی دعوت دیتے ہوئے ”اصلاح“ کا لفظ استعمال کرنے میں ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس میں عاجزی، انکساری اور عبدیت کا اظہار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جبکہ ”انقلاب“ کے لفظ کی ادائیگی ہی سے ہمارے لہجوں میں سختی، رعونت، رعب اور فخر پیدا ہو جاتا ہے۔

جواب:

ہمارے نزدیک اختلاف تسمیہ کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے جبکہ علماء کا اصول لامشاحۃ فی الاصطلاح معروف ہے، اور یہ اختلاف ذوق لطیف کے لیے ضروری بھی ہے۔ آخر پھول کے مضمون کو سورنگ سے باندھنے کا بھی ایک خاص مزہ ہے۔ یہی وجہ ہے لفظ اصلاح مولانا مودودی کی ایک ہی مستقل اصطلاح نہیں ہے۔ مولانا کے تخلیق کردہ ادب کا ہر قاری جانتا ہے کہ مولانا نے اسلام کے غلبے کے لیے کئی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ان میں سے چند اہم اصطلاحات یہ ہیں: خلافت الہیہ، حکومت الہیہ، خدائی بادشاہت، نظام اسلامی، اعلائے کلمۃ الحق، اعلائے کلمۃ اللہ، تجدید دین، احیائے دین، اسلامی انقلاب، اسلامی تحریک، اقامت دین، شہادت حق، تحریک اسلامی، اصلاح، انقلاب

امامت، اصلاحی انقلاب وغیرہ۔ مولانا نے اپنے مضمون اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے، میں اصلاح کا لفظ ایک آدھ بار جب کہ انقلاب کا لفظ ایک درجن سے زائد بار استعمال کیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے، تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم، زیر عنوان اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے، صفحہ ۱۶۱ تا ۱۹۰)۔ اب کیا جناب رشید صاحب اپنے الفاظ کی لاج رکھتے ہوئے کہ ”جدید دنیا کا ہر ظالم اور آمر انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے“ مولانا مودودیؒ کی ذات گرامی پر ان ناپسندیدہ القاب کی تہمت لگانے کی جسارت کریں گے؟ تنظیم اسلامی بھی غلبہ دین کے لیے صرف انقلاب کی اصطلاح استعمال نہیں کرتی۔ بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے اپنے ایک اہم مضمون اسلامی انقلاب، معنی و مفہوم اور اس کے لیے قرآنی و دیگر اصطلاحات (شائع شدہ، نوائے وقت و میثاق نومبر ۱۹۹۲) میں اضافی طور پر، تکبیر رب، غلبہ دین حق (اظہار دین حق، ماخوذ از التوبہ ۳۳)، دین کا بالکلیہ اللہ کے لیے ہو جانا (ماخوذ از الانفال ۳۹)، قیام عدل و قسط (ماخوذ از الحدید: ۲۵) وغیرہ بھی بیان کی ہیں۔

مولانا مودودیؒ اپنی ایک تحریر میں تین اصطلاحات، اقامت دین، شہادت علی الناس اور تحریک اسلامی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”پہلے دو لفظ قرآن سے ماخوذ ہیں اور تیسرا لفظ عام فہم ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ پر اگر کسی نے ناک بھوں چڑھائی ہے تو اس لیے کہ انہوں نے ہماری اصطلاح سے اپنا مفہوم مراد لیا ہے، ہمارا مفہوم مراد لینے تو امید نہ تھی اس پر ناراض ہوتے“۔ (جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل، صفحہ ۸)

بالکل اسی طرح ہم لفظ انقلاب کو آسان فہم ہونے کے سبب استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ دینی فرائض اور ان کے لوازم کے تحت لکھتے ہیں:

”اس ضمن میں تین باتیں بنیادی و اساسی ہیں اور تین ہی ان کے لوازم ہیں۔ یہ گل چھ باتیں ہوں گی۔ تین بنیادی و اساسی باتوں کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ ابتداء بھاری بھر کم اصطلاحات سے ہٹ کر ان کو عام فہم انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس میں شک نہیں کہ اصطلاحات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ہر علم اور ہر فن کا اصل اور حقیقی فہم انہی اصطلاحات کے حوالے سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ فزکس نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ کی گرفت میں اس کی بنیادی اصطلاحات (basic terminologies) نہ آجائیں۔ اسی طرح ہمارے دین کی بھی اصطلاحات ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ پہلے ان اصطلاحات سے ذرا ہٹ کر بات اصولاً سمجھ لی جائے۔

ان تین بنیادی و اساسی باتوں میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود دین پر عمل پیرا ہوں اس پر کاربند

ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ہم دین کو پھیلائیں۔ اور تیسری یہ کہ ہم دین کو قائم کریں۔ یہ ہیں تین بنیادی و اساسی باتیں۔ اب ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ بھی سمجھ لیجیے۔۔۔۔۔“ (فرائض دینی کا جامع تصور صفحہ ۴)

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے دینی فرائض کو آسان اصطلاحات میں بیان کرنے کے بعد ہر ایک کے لیے قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ ایک سے زیادہ دینی اصطلاحات استعمال کر کے بات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”اللہ جانے ہم نے دین کی کتنی عظیم اصطلاحات کو بدنام کر چھوڑا ہے۔ لیکن اس وجہ سے ہم دین کی کسی بھی اصطلاح کو ان شاء اللہ ترک نہیں کریں گے، بلکہ ان میں اصل روح چھونکنے کی ہر امکانی کوشش کریں گے۔“ (فرائض دینی کا جامع تصور صفحہ ۲۹)

اب اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے دینی اصطلاحات کو ترک کبھی نہیں کیا بلکہ ابتدائی مرحلے میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے بھاری اصطلاحات سے قطع نظر کرتے ہوئے، آسان یا رائج اصطلاحات میں بات کی ہے اور پھر اصل اصطلاحات کے حوالے سے بھی بات کی ہے۔ مثلاً انقلاب ہی کو لیں جسے ہم اسلامی حکومت یا قیام نظام اسلامی کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ، دیگر دینی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں جن کا ذکر پیچھے گزر چکا۔

صاحب مضمون کی تحریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انقلاب کی اصطلاح کا استعمال طریق انبیائے کرام کے برعکس کوئی چیز ہے اور انبیائے کرام، عبدیت، تقویٰ اور اصلاح کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ جہاں تک عبدیت اور تقویٰ کی اصطلاحات کا ذکر ہے تو ہمیں یقین ہے کہ موصوف کی نظر سے تنظیم اسلامی کے دعوتی و تربیتی لٹرچر کا ایک ابتدائی قاعدہ ”فرائض دینی کا جامع تصور“ ضرور گزرا ہوگا۔ وہ اس میں عبدیت اور تقویٰ کے ساتھ کم از کم دس مزید اصطلاحات بھی موجود پائیں گے جن کے ذریعے دعوت اسلامی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور جو قرآن وحدیث کی نصوص سے منصوص کی گئی ہیں۔ البتہ قرآن پاک میں اصلاح کا لفظ شعیبؑ کے قول کے طور پر (الاعراف: ۸۵، ہود: ۸۸) جبکہ ایک مقام (الاعراف: ۵۶) میں خطابِ الہی کے طور پر نقل ہوا ہے۔ البتہ نبی اکرم ﷺ کے لیے یا کسی اور نبی کے لیے یہ لفظ استعمال ہی نہیں ہوا۔ امت محمدی سے خطاب کے ضمن میں اس مصدر کے بہت سارے مشتقات ضرور استعمال ہوئے ہیں لیکن ان میں سے کسی جگہ بھی اجتماعی اصلاح، انقلاب، یا اسلامی حکومت یا قانون کے قیام ونفاذ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ کئی جگہ تو یہ لفظ کسی شخص کی توبہ کے بعد پرہیزگاری اور کئی جگہ مختلف فریقین کے مابین صلح کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے علم کی حد تک نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں یہ لفظ اپنے لیے استعمال نہیں فرمایا۔ اب سوچا جاسکتا ہے کہ جب قرآن میں یہ لفظ صرف ایک نبی کے

لیے استعمال ہوا ہے تو اس کے استعمال پر اصرار شدید اور ترک پر اعتراض زجر و توبیخ کتنا مناسب ہے؟ پھر ہمارے دین میں کئی اصطلاحات ایسی ہیں جو در نبوی ﷺ میں موجود نہ تھیں لیکن بعد کے علماء نے عصری علمی ضروریات کے تحت انہیں رائج کیا۔ بطور مثال سنت مؤکدہ، مکروہ تنزیہی، مکروہ تحریمی وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

الحمد للہ! اصلاح کے لفظ کو استعمال کرنے پر ہمیں نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ ہی اس پر ہم کوئی شرم محسوس کرتے ہیں بلکہ چونکہ قرآن حکیم میں ایک جلیل القدر نبی سے اس لفظ کا استعمال ثابت ہے، لہذا دیگر اصطلاحات کے ساتھ ”اصلاح“ کو ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ البتہ رائج الوقت اردو محاورے میں اس لفظ کا غالب استعمال انفرادی اصلاح کے لیے رائج ہے۔ لہذا ہمیں اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے اس کے ساتھ انفرادی یا اجتماعی کا سابقہ لگانا چاہیے یعنی انفرادی اور اجتماعی اصلاح۔ اس لفظ کو بطور اصطلاح استعمال کرنے کے باوجود مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

”ہماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آیا ہے تو ذہن معًا چھوٹی برائیوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور پھر ہر نشتر اصلاح اسی پرانے مذاق کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ اب آپ لوگ اس مذاق کو یکسر بدل ڈالیں۔“ (ہماری تبلیغی پالیسی، رواد جماعت اسلامی، حصہ دوم، صفحہ ۷۷)

جہاں تک اس مفروضے کا تعلق ہے کہ لفظ اصلاح میں عاجزی، انکساری اور عبدیت کا اظہار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جبکہ ”انقلاب“ کے لفظ کی ادائیگی ہی سے ہمارے لہجوں میں سختی، رعونت، رعب اور فخر پیدا ہو جاتا ہے۔ غور فرمائیے بعض دفعہ اچھے ناموں کی پشت پر برے تصورات بھی پائے جاتے ہیں مثلاً در نبوی ﷺ میں منافقین اصلاح کا لفظ استعمال کر کے فساد مچایا کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ﴾۔ جدید دنیا میں رونما ہونے والا اکثر فساد، بعنوان اصلاح یا دیگر اچھے الفاظ ہی سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ یورپ کی تحریک اصلاح مذہب اس کی نمایاں مثال ہے۔ عصر حاضر کے بعض متجددین اور ماضی قریب کے بعض مناظرین، تجدید و اجتہاد کے نام پر دین کی جو درگت بنانے کی سعی نامراد کر چکے ہیں وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ لہذا اہمیت صرف اصطلاح کی نہیں بلکہ پس پردہ اور پیش نظر مقاصد کی بھی ہے۔ اگر اصلاح کا لفظ استعمال کرنے والے انفرادی تربیت و تزکیہ کے ساتھ ساتھ نظام حکومت، کاروباری اداروں، معاشی سرگرمیوں، عائلی قوانین، فوجداری قوانین، کی اصلاح بھی چاہتے ہیں تو ہمارے نزدیک لفظ اصلاح کا استعمال محمود ہے اور اسے ہی ہم انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں (جاری ہے)

افریقہ میں مسلمانوں کی نسل کشی

بی بی سی لندن کی یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ افریقہ سے کس طرح مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی کوششیں ہو رہی ہیں (اگرچہ بروزن بیت مسلمان؟ انتہا پسند گروہوں کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے)۔ ہماری بے بسی اور نالائقی کی انتہا یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی ادارہ نہیں جو مسلم امہ کے صحیح حالات ہم تک پہنچائے اور کوئی ایسا ادارہ نہیں جو حالات کی اصلاح کے لیے کوئی کوشش کرے۔ اسلام اور مسلم دشمنوں نے ہماری قیادتوں کو ایفون پلا کر سلا رکھا ہے اور ہم بے حسی کے ہلکوروں میں مست ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں احتساب نفس اور اپنی اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (ادارہ)

انسانی حقوق کے علم بردار ایک بین الاقوامی گروپ کا کہنا ہے کہ وسط افریقی ریاست میں عالمی امن فوج مسلمانوں کی نسلی تطہیر روکنے میں بری طرح ناکام ہو گئی ہے۔ انٹرنیشنل نے ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ وسط افریقی ریاست میں پے در پے مظالم کے باعث مسلمان اتنے بڑے پیمانے پر انخلا کر رہے ہیں کہ اسے آسانی سے تاریخی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ملک میں چونکہ تھوک اور پرچون کا دھندا بہت حد تک مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، اس لیے معاشی حالات کی خرابی کے باعث اب خوراک کا شدید بحران پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے ورلڈ فوڈ پروگرام نے اب طیاروں سے خوراک پہنچانا شروع کی ہے۔ یہ منصوبہ ایک ماہ تک جاری رہے گا۔ ورلڈ فوڈ پروگرام کے ترجمان الیکسز مسکیریلی نے بی بی سی کو بتایا کہ سڑک کے راستے خوراک پہنچانا انتہائی خطرناک ہے، اس لیے خوراک گرانے کا آپشن اپنایا گیا ہے۔ خوراک پہنچانے کے پروگرام پر زیادہ رقم خرچ ہو رہی ہے اور یہ پروگرام پڑوسی ملک کیمرون کے تعاون سے شروع کیا گیا ہے، جس نے لاجسٹک سپورٹ فراہم کی ہے۔ پہلی کھیپ ۸۲ ٹن چاول کی تھی، جس کے بعد ۱۸۰۰ ٹن دلیہ پہنچایا گیا۔ بڑے پیمانے پر خوراک کی فراہمی جاری رہے گی تاکہ کوئی بڑا انسانی المیہ رونما نہ ہو۔

اب تک جتنی خوراک پہنچائی گئی ہے، وہ ڈیڑھ لاکھ افراد کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی تھی جب کہ پورے ملک میں مجموعی طور پر بارہ لاکھ پچاس ہزار سے زائد بے گھر افراد کو خوراک پہنچانا گزیر ہے کیونکہ ان کے پاس خوراک حاصل کرنے کے ذرائع انتہائی محدود ہو چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ذرائع نے بتایا ہے کہ بحران سے دو چار ہونے والے افراد میں ۹۰ فیصد صرف ایک وقت کا کھانا حاصل کر پارہے ہیں۔ دارالحکومت بانگوئی سے بیشتر مسلم تاجر نقل مکانی کر گئے ہیں، جس کے باعث خوراک کی قیمتیں آسمان سے

باتیں کر رہی ہیں۔

دارالحکومت کے مختلف علاقوں سے نقل مکانی کر کے ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں نے باگونی ہوائی اڈے پر پناہ لے رکھی ہے۔ ترجیحی بنیاد پر انہیں خوراک فراہم کی جائے گی۔ ملک بھر میں لوگوں نے مساجد، گرجوں اور اسکولوں میں پناہ لے رکھی ہے۔ انہیں بھی ترجیحی بنیاد پر خوراک دی جائے گی۔

وسط افریقی ریاست میں ایک سال سے بھی زائد مدت سے سیاسی بحران چل رہا ہے، جو اب غیر معمولی شدت اختیار کر چکا ہے۔ فرانس نے امن فوج کے لیے ایک ہزار چھ سو اور افریقی ممالک نے مل کر ساڑھے پانچ ہزار فوجی فراہم کیے ہیں۔ فرانس کے وزیر دفاع ٹاں ویز لے دریاں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے گزشتہ ہفتے وسط افریقی ریاست کے دارالحکومت باگونی کا دورہ کیا۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ملک مسلم اور عیسائی علاقوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ ایک بیان میں بان کی مون نے کہا کہ مسلم اور عیسائی دونوں ہی منظم طریقے سے، بڑے پیمانے پر قتل کیے گئے ہیں تاکہ بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہو۔ ملک کا باضابطہ جغرافیائی طور پر منقسم ہونا تو دور کی بات لگتا ہے مگر حالات نے بڑے پیمانے پر آبادیوں کی نقل مکانی کو ایک تلخ حقیقت بنا دیا ہے۔

وسط افریقی ریاست میں گزشتہ سال مسلم باغی فورس ”سیلکا“ نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا، جس کے باعث مبینہ طور پر عیسائیوں کو قتل کیا گیا اور بڑے پیمانے پر زیادتی کے واقعات بھی ہوئے۔ ”سیلکا“ گروپ نے جنوری میں اقتدار چھوڑ دیا تھا مگر اس کے باوجود عیسائیوں نے مختلف گروپوں کی شکل میں اب تک مسلمانوں سے انتقام لینا ترک نہیں کیا ہے اور ملک بھر میں مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بتایا ہے کہ بعض علاقوں میں امن فوج نے بھی تشدد کو راہ دی ہے۔ ”سیلکا“ کے دستبردار ہونے سے طاقت کا جو خلا پیدا ہوا ہے، اسے پُر کرنے کے لیے عیسائی گروپوں کو کھل کر من مانی کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ ایمنسٹی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انٹی بلاکا (عیسائی) گروپوں کو کنٹرول کیا جائے اور ان علاقوں میں امن فوج کے مزید دستے تعینات کیے جائیں، جہاں مسلمانوں کو مسلسل دھمکایا جا رہا ہے۔ وسط افریقی ریاست میں فرانسیسی مشن کے سربراہ جنرل فرانسکو سوریا تو نے کہا ہے کہ انٹی بلاکا فورسز امن کی دشمن ہیں۔ ایمنسٹی نے یہ بھی بتایا ہے کہ دارالحکومت باگونی سے فرار ہو جانے کے بعد بھی مسلم سیلکا ملیشیا کے ارکان عیسائیوں پر حملے کر رہے ہیں۔ ایمنسٹی میں سینئر کرائسز ریسپانس ایڈوائزر جوآن میرنر کا کہنا ہے کہ وسط افریقی ریاست میں صورت حال توجہ کا تقاضا کر رہی ہے۔ ان کے خیال میں امن فوج کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ ایک طرف تو اسے امن برقرار رکھنا ہے، ساتھ ہی ساتھ زیادہ حساس اداروں میں لوگوں کو تحفظ دینا ہے اور مختلف علاقوں سے بڑے پیمانے پر آبادی کا انخلاء روکنا ہے۔

لبرل ازم کیا ہے؟

لبرل ازم سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو وہ نظریاتی جواز فراہم کرتا ہے جو تاریخی طور پر سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام زندگی یورپ میں چودھویں صدی عیسوی سے رائج ہونا شروع ہوا۔ اس نظام زندگی کی توجہ ان عیسائی مفکرین نے کی جو پوپ اور کیتھولک ازم (Catholicism) کے باغی تھے لیکن یہ توجہات سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے فروغ اور استحکام کے لیے زیادہ کارآمد نہ ہو سکیں۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں جو غیر کیتھولک ریاستیں یورپ میں قائم ہوئیں وہ مذہبی ریاستیں تھیں اور انہوں نے سرمایہ دارانہ نظم معاشرت کے فروغ کی راہ میں مختلف پابندیاں عاید کیں۔ ان مذہبی ریاستوں کے خلاف سرمایہ دارانہ حلقوں نے جو بغاوت برپا کی وہ لبرل ازم ہے۔ لبرل ازم کا بانی مفکر جان لاک (John Locke) ہے۔ میری رائے میں لبرل ازم کی پانچ صدیوں کی تاریخ میں اس سے زیادہ مؤثر مفکر پیدا نہیں ہوا۔ یہ اتنا صاحب اثر مفکر ہے کہ اس نے دور حاضر کی اسلامی فکر کو بھی متاثر کیا ہے اور بیسویں صدی کے ایک اہم اسلامی سیاسی مفکر مولانا مودودیؒ جان لاک کے کلیدی تصورات کی اسلام کاری اپنی کتابوں مثلاً ”تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں“ اور ”خلافت و ملوکیت“ میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جان لاک اس عیسائی ریاست کا باغی تھا جو کرا مویل (Oliver Cromwell) نے سترہویں صدی کے وسط میں برطانیہ میں قائم کی تھی جو لگ بھگ چالیس سال تک قائم رہی۔ لاک کی اہم ترین کتاب ”The Second Treatise on Government“ ہے اور اس کتاب میں لبرل انفرادیت، معاشرت اور ریاست کے جو تصورات پیش کیے گئے ہیں لبرل مفکرین پچھلے پانچ سو سال سے ان کی تشریح اور تفصیل ہی بیان کر رہے ہیں۔ ان تصورات کی فلسفیانہ توجیہ آگلی صدی میں فرانس کے روسو (Rousseau) اور جرمنی کے کانٹ (Immanuel Kant) نے کی اور اٹھارہویں صدی میں اس فکر کی بنیاد پر امریکا اور فرانس میں کامیاب سیاسی انقلاب برپا کیے گئے۔ اٹھارہویں صدی کے یورپ میں لبرل ازم کی مربوط اور منظم فکری مزاحمت نظر نہیں آتی اور عیسائی سیاسی تصورات لبرل مباحث میں ضم ہوتے نظر آتے ہیں۔ انیسویں صدی میں کارل مارکس (Marx) اور نیشے (Nietzsche) لبرل ازم کے اہم فکری مخالفین کے طور پر ابھرے اور انہوں نے اشتراکیت اور قوم پرستی کو سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے فروغ کے لیے زیادہ سازگار نظریات

کے طور پر پیش کیا۔ اشتراکیت اور قوم پرستی کامیاب عوامی تحریکیں برپا کرنے میں کامیاب ہو گئیں اور جرمنی، جاپان، روس اور چین میں قوم پرست اور اشتراکی ریاستیں قائم ہو گئیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے فروغ اور استحکام کے لیے یہ اتنی مفید ثابت نہ ہو سکیں جتنی لبرل ریاستیں۔ عیسائی فکر کی طرح قوم پرستانہ اور اشتراکی فکر بھی بتدریج لبرل مباحث میں ضم ہوتی چلی گئی۔ بیسویں صدی سے لبرل ازم کو دودھ دیگر سرمایہ دارانہ نظریات یعنی مابعد استعماریت (Post Colonialism) اور مابعد جدیدیت یا پوسٹ ماڈرنزم (Post Modernism) کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ فکری سطح پر مابعد استعماریت کے چیلنج کو امریکی مفکرین جان راولز (John Rawls) اور تھامس اینجلز (Thomas Angel) نے لغو (Incoherent) ثابت کیا اور پوسٹ ماڈرنزم کا حتمی ورژن جرمن مفکرین ہبیر ماس (Habermas) اور گیڈمور (Gadamer) نے مرتب کیا۔ مابعد جدیدیت اور مابعد استعماریت ان معنوں میں ناکام تحریکیں ہیں کہ وہ سرمایہ کی مسلسل بڑھوتری کے لیے لبرل ازم سے بہتر معاشرتی اور ریاستی ادارتی صف بندی کے تصورات پیش کرنے سے قاصر رہیں لیکن ان معنوں میں یہ تحریکیں کامیاب رہیں کہ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے ایسے تضادات کی نشاندہی کی جنہیں رفع کرنے کی استطاعت لبرل نظریات نہیں رکھتے۔

لبرل نظام فکر ان معنوں میں یقیناً ایک بحران کا سامنا کر رہا ہے کہ اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ لبرل اہداف یعنی ”آزادی“ اور ”ترقی“ ناقابل حصول اہداف ہیں لیکن یہ بات صرف منطقی اور فکری سطح پر واضح ہوئی ہے اور کوئی بھی لبرل مفکر آج یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ لامحدود ترقی اور آزادی قابل حصول اہداف ہیں (یہ بات سب سے واضح طور پر ان مباحث میں پائی جاتی ہے جن کی ابتدا ہائیڈیگر (Heidegger) نے کی اور جو آج کل (Complexity Theory) کہلاتی ہے) اور یہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی شکست و ریخت کا ایک مظہر ہے کیوں کہ آزادی اور ترقی صرف لبرل ازم کے اہداف نہیں وہ قوم پرستی اور اشتراکیت کے بھی اہداف ہیں۔ لبرل ازم، اشتراکیت اور قوم پرستی کی لغویت کا اظہار سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی بتدریج شکست و ریخت کا ایک مظہر ہے لیکن جیسا کہ Slavoj اور Alain Isadion اور Zizek واضح کرتے ہیں کہ ابھی یہ بات بالکل عیاں نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام حیات کا متبادل کیا ہے؟ Zizek کہتا ہے کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں وہ ایک Liminal دور ہے۔ یہ واضح ہو گیا ہے کہ آزادی اور ترقی غیر معقول اور لغو اہداف ہیں لیکن انسانوں کی بہت بڑی اکثریت انہی نامعقول اور لغو اہداف پر ایمان رکھتی ہے اور رائے عامہ کو متاثر کرنے والے تمام مباحث (Policy discourses) انہی اہداف کے حصول کی حکمت عملیاں ترتیب دیتے نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی سرمایہ دارانہ مخالف مزاحمتی تحریک آزادی اور ترقی کے اہداف کو واضح طور پر رد نہیں کرتی بلکہ اپنی مزاحمت کو حصول آزادی اور ترقی کا ذریعہ گردانتی

ہے۔ ان حالات میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا متبادل کیا ہوگا اور کتنی صدیوں تک گولگو کی یہ کیفیت جاری رہے گی؟ اسلامی تحریکوں میں یہ رائے عام ہے کہ آنے والا نظام اسلام ہی ہوگا لیکن لگتا تو ایسا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کے ظہور میں ابھی کئی ہزار سال کا وقفہ باقی ہے۔ آج تحفظ دین اور غلبہ دین کی جدوجہد نہایت منتشر، غیر مربوط اور سست روی کا شکار ہے۔ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد محدود ہے اور نو مسلموں کی عظیم اکثریت مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی طرح سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو رد کرنے کی نہ استطاعت رکھتی ہے اور نہ خواہش۔ علما اور صوفیا فرقہ وارانہ جھگڑوں میں بری طرح پھنسے ہوئے اور غلبہ دین کی جدوجہد سے قطعاً تعلق ہیں۔ اسلامی تحریکیں سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کا جزو الاینفک بنی ہوئی ہیں اور ایران، سوڈان، مصر وغیرہ میں جو اسلامی حکومتیں قائم ہوئی ہیں ان سب نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ ان ریاستوں کو عوامی پذیرائی حاصل نہیں اور مجاہدین اسلام عوامی مقبولیت حاصل کرنے کی کوئی جدوجہد مرتب کرنے کے خاص قائل نہیں۔ ان کا رویہ تو اس شعر سے عیاں ہے۔

راہ خدا کے متوالے ہیں اس سے بالکل بے پروا ہیں

کون ہے راضی کون خفا ہے، زنداں زنداں مقتل مقتل

اس طرح جہاد جاری تو صدیوں تک رہ سکتا ہے لیکن اس جہاد کے ذریعے توسیع پذیر نظام قائم نہیں کیا جاسکتا۔ ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ مستقبل قریب میں ہمیں عالمی نظامی غلبہ حاصل ہوگا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ یقیناً ممکن ہے کہ اسلام علمی لحاظ سے سرمایہ دارانہ نظام کے عالمی متبادل کے طور پر ابھرے لیکن یہ کافی نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمیں ایک طویل مدتی منصوبہ بند جدوجہد کرنا پڑے گی۔

وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے

نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اس جدوجہد کی ابتداء سرمایہ دارانہ نظریات سے اچھی طرح واقفیت پر منحصر ہے۔ ذیل میں لبرل تصورات کی تشریح کرنے کی کوشش کروں گا۔ (جاری ہے)

اسلام اور پاکستان

☆ فضل کریم بھٹی

پاکستان میں برٹش کلچر کا غلبہ اسباب اور علاج

پاکستان ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ یہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی طویل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ اس کے قیام کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان تقریباً ایک ہزار سال سے مسلمان بادشاہت کے زیر سایہ زندگی گزار رہے تھے۔ اگرچہ بادشاہ مطلق العنان تھے لیکن ملک کا قانون شریعت پر قائم تھا۔ سیاسی معاملات میں بادشاہ عموماً بدعنوانی کرتے تھے لیکن پھر بھی مسلمانوں کو اہل وطن ہندوؤں پر بالادستی حاصل تھی۔ مغلیہ سلطنت کے بعد جب انگریز کی عمل داری شروع ہوئی تو انگریز نے سلطنت مغلیہ کے زمانے کا نظامِ تعلیم ختم کر دیا اور اپنا نظامِ تعلیم قائم کیا۔ پرانا نظامِ تعلیم مسلمان علماء کے ہاتھ میں تھا جو ختم ہو گیا۔

مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی یلغار سے بچانے کے لیے علماء نے محسوس کیا کہ مغربی تعلیم مسلمانوں کے لیے بہت نقصان دہ ہے اس لیے انہوں نے اپنا پرانا نصابِ تعلیم جاری رکھا۔ نئے بدلے ہوئے حالات کے لیے نئے نصاب کی ضرورت تھی تاکہ مسلمانوں کی مذہبی عبادات اور معاملات کی ضروریات بھی پوری ہوں اور وہ وقت اور زمانے کی ضروریات پوری کر سکیں مگر علماء جاہد تقلید کے عادی تھے اس لیے انہوں نے ۱۸۶۶ء میں مدرسہ دیوبند میں درسِ نظامی ہی جاری رکھا۔ درسِ نظامی ملاً نظام الدین فرنگی مہلی متوفی ۱۷۴۶ء نے تیار کیا تھا جو اپنے وقت میں بہترین نصابِ تعلیم تھا لیکن اب اپنی افادیت کھو بیٹھا تھا۔ بہر حال علماء پرانے نصابِ اسلامی پر جم گئے اور ابھی تک اُسی پر جمے ہوئے ہیں۔ جب مسلمان انگریز کی عمل داری میں زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں پس ماندہ رہ گئے تو بعض اہل فکر و نظر مسلم علماء نے مغربی علوم و فنون کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے سرسید احمد خاں کی سرکردگی میں علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا اور اسلامیہ سکول قائم کیے۔ اس طرح ہماری تعلیم میں ثنویت یا دوئی پیدا ہوئی جو ابھی تک قائم ہے۔

نظامِ تعلیم کی ثنویت نے ہمیں بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ پرانا نظامِ تعلیم جو دینی مدرسے کہلاتا ہے، جدید علم و فنون سے کورا ہے اور جدید درس گاہیں اسلامی علوم و فنون کی تسلی بخش تعلیم نہیں دے رہیں۔ جدید درس گاہوں پر سیکولر علوم و فنون کا غلبہ تھا جو علومِ اسلامی کے داخل کرنے سے کم نہیں ہوا۔ جب تک ہم میں تعلیمی

☆ مکان نمبر ۶۰۸۔ سٹریٹ نمبر ۱۴، سیکڑا، عسکری ۱۴ - راولپنڈی

شعوبیت ختم نہیں ہوتی ہم ایک متفرق اور منقسم گروہ ہی رہیں گے، ایک قوم نہیں بن سکتے۔ ہم میں یک سوئی اور یک رنگی پیدا نہیں ہوگی، ہم اپنی پسماندگی دُور نہیں کر سکیں گے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل نہیں کر سکیں گے۔

روایت پرست علماء چونکہ جدید علوم و فنون سے نااہل ہیں اس لیے قوم کی اکثریت کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں شروع سے دردمند اہل دل مسلمان دانشوروں نے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ قدیم یونانی علوم و فنون کی جگہ جدید علوم و فنون سیکھ کر عوام کی رہنمائی کریں لیکن اُن کی نفسیات یہ ہے کہ وہ اس طرف نہیں آتے۔ وہ صاف فرماتے ہیں کہ ہم قرآن و حدیث جانتے ہیں ہمیں کسی اور علم کی ضرورت نہیں۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کرو اور حکمت پر زور دیتا ہے وہ حکمت ہم کم کر بیٹھے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو فضلیں مدرسوں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں جن کے لیے کوئی روزگار نہیں۔ وہ تعلیم حاصل کر کے جب مسجدوں اور مدرسوں کا رُخ کرتے ہیں تو وہاں نہیں پیش امام اور خطیب کی ملازم میسر نہیں ہوتی تو پھر اپنی اپنی مسجدیں بناتے ہیں۔ اس طرح ہر گلی محلے میں تین تین چار چار مسجدیں بن جاتی ہیں پھر فرقہ بندی پر دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں اور قوم تقسیم در تقسیم ہوتی ہے۔ انتہا پسندی اور شدت پسندی پروان چڑھتی ہے اور پھر دہشت گردی دہشت پھیلاتی ہے جس کا ازالہ جامع اسلامی نظام تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو علم و حکمت سے لبریز ہے۔ ہم اسے بغیر سمجھے ناظرہ پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ہم قرآن حفظ کرتے ہیں لیکن بغیر سمجھے حالانکہ جو شخص قرآن حفظ کرتا ہے وہ غیر معمولی انسان ہوتا ہے اور وہ بغیر سمجھے ساری عمر قرآن مجید پڑھتا اور سناتا رہتا ہے۔ ایسے حفاظ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ہیں جو رمضان میں قرآن سنانے کے بعد سارا سال چھوٹے موٹے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر ایسے حفاظ کو دینی اور عمرانی علوم پر اعلیٰ تعلیم دلا کر سکولوں اور کالجوں میں بچہ رکھ لیا جائے تو وہ معاشرے کے لیے بہت مفید ہوں گے۔ اگر یہ حفاظ خود پانچ سات مہینے لگا کر عربی لغت اور گرائمر یا صرف نحو سیکھ لیں تو قرآن کو سمجھ کر پڑھ سکیں گے اور خود قرآن سے پورا پورا فیض حاصل کریں گے۔

نظام تعلیم کی اصلاح شدت پسندی اور دہشت گردی کو ختم کرنے کی کلید ہے

اگر ہم نظام تعلیم کی اصلاح کر لیں۔ دینی تعلیم کا خاطر خواہ اور تسلی بخش انتظام سکولوں اور یونیورسٹیوں میں کر لیں۔ یونیورسٹیوں سے پیش امام، خطیب اور علماء دین تیار کریں تو ہماری سوسائٹی میں مسٹر اور مولوی کی تقسیم ختم ہو جائے گی۔ قوم میں یک سوئی اور یک رنگی پیدا ہوگی۔ درس نظامی کے مدرسوں کی بجائے وہاں کے طالب علم یونیورسٹیوں کی طرف لانے کے لیے وظائف اور دیگر سہولیات

دینی چاہئیں۔ اس طرح ہم میں شدت پسندی اور دہشت گردی ختم ہو جانے کی امید ہے۔

برٹش کلچر کا غلبہ اور اُس کا سد باب

انگریز نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا اُس وقت مسلمان انحطاط اور زوال کی آخری سرحدوں کو پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان اُمرا نے شہنشاہ ہند کو شاہ شہنشاہ بن کر رکھا تھا۔ مسلمان اُمرا میں ایرانی اور تورانی کی تقسیم شدت اختیار کر گئی تھی یہ اصل میں شیعہ سنی تفریق تھی۔ ان اُمرا کو خود غرض اور ہوس اقتدار نے اندھا کر دیا تھا۔ یہ خود غرضی میں اتنے اندھے تھے کہ ان سے فہم و فراست، علم و حکمت اور حالات کی بصیرت رخصت ہو گئی تھی۔ ان میں کفر و اسلام کا تصور ختم ہو چکا تھا اور یہ صرف اپنی ذات اور مفاد پرستی کا سوچتے تھے۔ اسلام کا نظام اعلیٰ و ارفع آفاقی اصولوں پر قائم ہے یہ اُس کو بھلا بیٹھے تھے۔ بادشاہ کو اپنے ذاتی فوائد کے لیے استعمال کرتے۔ یہ نام مذہب کا لیے لیکن باتیں بڑے بڑے اصولوں کی کرتے تھے لیکن اعمال گھٹیا تھے۔ انہوں نے اسلام کو اپنے اپنے تنگ دامنوں میں فرقوں کے نام پر گھیرا ہوا تھا۔ آخر ہندوؤں کی قویں جیسے مرہٹے، جاٹ اور سکھ طاقت ور ہو گئے اور یہ اُن کے دست نگر ہو گئے، آخر ملک گنوا بیٹھے۔

انگریز نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو سلطنت مغلیہ کے پرانے ملازم اور اہل کار فارغ کیے گئے۔ فوج، انتظامیہ اور عدلیہ کو ختم کیا اور اپنا نظام حکومت قائم کیا۔ سب حکمرانوں کی طرح اپنے ڈھنگ اور کام کے لوگوں کو اپنی ملازمت میں لیا۔ اپنے وفادار قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں سے خوب کام لیا۔ اُن کو نوازا اور اپنے نئے وفاداروں کو جاگیریں دیں، زمینیں دیں، وظیفے دیئے اور خطابات سے نوازا۔ موجودہ پاکستان کے ان لوگوں کو برٹش امپیریلزم کا دست و بازو بنایا۔ ان لوگوں نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے کوئی کام نہ کیا بلکہ فینس (Fence) یا دیوار تقسیم پر بیٹھے رہے جب پاکستان بن گیا تو یہ لوگ اپنے قبائلی اور ذات برادری میں اثر و رسوخ کی وجہ سے ملک کی قانون ساز اسمبلیوں میں پہنچ گئے۔ انہوں نے ملک کی دولت کو خوب لوٹا اور اس کے بعد ان کے اخلاف اور اولاد وہاں پہنچ گئی۔ یہ ابھی تک انگریز کے گیت گاتے ہیں اور اپنی قوم کے عوام کو رعیت سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم کے خلاف ہیں اس لیے کہ عوام تعلیم حاصل کر کے اپنے حقوق مانگیں گے۔

برٹش کلچر کا گہرا اثر تو سارے ملک کی اشرافیہ پر ہے لیکن بڑے زمینداروں، جاگیرداروں، فوج، عدلیہ اور بیوروکریسی پر زیادہ ہے۔ سب سے زیادہ فوج پر ہے۔ انگریز کو رخصت ہوئے چھیا سٹھ سال ہو چکے ہیں۔ ملک میں کوئی انگریز ملازم نہیں لیکن ہم حکومت کی سرکاری زبان انگریزی کو اپنائے ہوئے ہیں حالانکہ ہماری اپنی زبان اُردو ایک ترقی یافتہ زبان ہے جو دو سو سال سے بولی جا رہی ہے اور وسیع لٹریچر

رکھتی ہے۔ یاد رہے سلطنت مغلیہ کی زبان فارسی تھی۔ دربار شاہی اور اعلیٰ طبقہ کی زبان فارسی تھی لیکن سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں اُردو وسیع طور پر بولی اور سمجھی جاتی۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر بڑا عمدہ شاعر تھا جس کا اپنا دیوان تھا۔ اُس زبان کو ہم سرکاری زبان نہیں بنا سکتے۔ انگریزی زبان کی اپنی افادیت ہے اور وہ بین الاقوامی زبان ہے لیکن قومیں اپنی زبان سے ہی پہچانی جاتی اور ترقی کرتی ہیں۔

آفرینش سے رنگ، نسل، مذہب اور زبان ایک قوم کو متحد کرنے کے ضروری اجزاء ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ ملک اسلام کی تجربہ گاہ اور لیبارٹری کے لیے بنایا تھا۔ قائد اعظم نے کئی بار فرمایا ہم پاکستان کو اسلام کی لیبارٹری بنائیں گے۔ بد قسمتی سے ہم باتیں تو اسلام کی کرتے ہیں لیکن اسلام کے نظم و ضبط کو منظور نہیں کرتے نہ اُس پر عمل کرتے ہیں۔ یہیں سے ہماری منافقت واضح ہو جاتی ہے۔ کوئی قوم مضبوط نہیں ہو سکتی اور نہ ترقی کر سکتی ہے جب تک وہ اپنے فکر و نظر کی پوری طرح پیروی نہ کرے۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام دین اسلام کی صورت میں موجود ہے لیکن ہم اُس پر صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے عمل نہیں کر رہے۔ دوسری طرف ہمارے روایت پرست علماء ہیں وہ ابھی تک قرونِ وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھے۔ جس وقت صحابہ نے دنیا کی دوسرے پاورز کو فتح کیا اُس وقت انہوں نے حق رائے دہی کے اصولوں پر خلافت قائم کی۔ بیعت خاصہ اور پھر بیعت عامہ کے ذریعے خلیفہ کا چناؤ کیا گیا۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں لیکن بیعت عامہ کا مطلب حق رائے دہی تھا۔ اس کا مطلب ہم بھی سمجھتے آئے ہیں کہ اسلام میں مطلق العنان بادشاہت یا شہنشاہیت نہیں ہے۔ جب دنیا میں بادشاہت قائم تھی اُس وقت خلافت اسلامیہ وجود میں آئی۔ بعد کے ادوار میں بادشاہت کو علماء نے اس لیے برداشت کیا کہ ایک روایت کے مطابق اگر بادشاہ شریعت پر چلے تو اُس کو برداشت کیا جائے لیکن اسلام میں اصل طرزِ حکمرانی جمہوری ہے جس میں مسلم عوام کی رائے ضروری ہے۔ اسلام کے اہل الرائے یا اہل حل و عقد کی بھی رضا مندی ضروری ہے۔ بہر صورت ہم اپنے شروع اسلام کے اصول مشاورت کو بھول چکے ہیں اور اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اسلام میں جمہوریت نہیں۔ مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت یا نظام مشاورت سے جوڑنا معقول بات معلوم نہیں ہوتی۔ اصل میں علماء جدید علوم و فنون کی ناواقفیت کی وجہ سے مسلم عوام سے دُور ہو گئے ہیں، اس لیے وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو نہیں سمجھتے اور وہ نہ نظام مشاورت کو خلافت راشدہ کے بعد عصرِ حاضر کے مطابق پیش کر سکے ہیں حالانکہ اس نظام کی ہر زمانے کے مطابق تشکیل نو کی جاسکتی ہے۔

ہم میں جو لوگ سیکولر یا لبرل ہیں اُن کو عام طور پر بے دین اور لادین کہا جاتا ہے۔ وہ اصل میں نادان بھٹکے ہوئے راہی ہیں۔ وہ قدامت پسند علماء کو اُن کی ظاہری بود و باش اور وضع قطع پر زور دینے کی وجہ سے انتہا پسند اور شدت پسند سمجھتے ہیں۔ اصل میں بھٹکے ہوئے راہی کو سیدھے راستے پر لانے کا بہتر طریقہ

یہ ہے کہ اسلام کے صحیح اصولوں و توحید، رسالت اور آخرت پر زیادہ زور دیا جائے تو سلیم الطبع لوگ جزئیات کو بھی درست کر لیتے ہیں۔ جدید اور قدیم کا بعد مٹایا جاسکتا ہے۔

برٹش نوآبادیاتی کلچر ہمارے لیے بہت نقصان دہ ہے لیکن اس سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم میں جدید علوم و فنون سے واقف ایسے دینی علماء درس گاہوں میں تیار ہوں اور وہ سیکولر اور لبرل اہل علم و دانش پر جدید طریقے سے تبلیغ کریں۔ برٹش نوآبادیاتی کلچر کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ برٹش امپیریل سسٹم تھا جہاں افسروں کو ان بان سے رہنا ہوتا تھا۔ اُس کے لیے انہوں نے بہت زیادہ عملہ رکھا ہوتا تھا جس کی جمہوری اور آزاد ملکوں میں ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ امریکہ کے سارے افسران اپنی خط و کتابت خود ٹائپ کرتے اور اپنے کاغذات خود فائل کرتے ہیں بس ایک دو معاون مدد کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ برٹش انڈین آرمی نے دیسی فوجیوں کے لیے ایک دیسی افسروں کا مڈل رینک رکھا ہوا تھا جس کو وہ وائسرائے کمشنڈ آفیسر کہتے تھے یا ہندوستانی سردار چونکہ انگریز آفسر فوجی سپاہیوں سے زیادہ ملنا پسند نہیں کرتے تھے ساتھ ہی زبان کا مسئلہ تھا۔ ہماری پانچ لاکھ کی فوج میں وہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں جبکہ ہمارے افسروں کو ان کی ضرورت نہیں ہے وہ ان کی زبان سمجھتے ہیں، ان کی عادات سمجھتے ہیں لیکن فوج کے افسر برٹش امپیریل کلچر سے باہر نہیں آسکے۔ ہمارے سول کے حکمران بھی اُس کلچر سے باہر نہیں آ رہے۔ فوج کے مڈل رینک کو ختم کر دینا چاہیے جس سے کروڑوں روپے بلکہ اربوں روپے ہر سال بچیں گے۔ بیورو کریسی اور جوڈیشری بھی نوآبادیاتی نظام سے باہر آئے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے اسلامی اور قومی فکر و نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے علماء ان ساری چیزوں کو نہیں سمجھتے وہ ان سب چیزوں سے بے خبر ہیں۔ یہ وہی کر سکتے ہیں جو در و دل رکھتے ہوں۔ اسلامی اور قومی نظام اور عصر حاضر کو سمجھتے ہوں اور پختہ ایمان و یقین رکھتے ہوں۔

حرف آخر

میری تلخ نوائی کو معاف کیا جائے اور ان تجاویز پر سنجیدگی سے غور کیا جائے جو میں نے پیش کی ہیں۔ دینی تعلیم کو جدید علوم و فنون سے ہم آہنگ کیا جائے۔ علم تو مومن کی گم کردہ میراث ہے اسے جہاں سے مل سکے حاصل کیا جائے۔ آخر ہمارے بزرگ علماء اور اہل علم و دانش نے یونانی علوم و فنون حاصل کیے جن کو ہم ابھی تک پڑھ رہے ہیں۔ کیا حکیم افلاطون، ارسطو، بقراط اور سقراط مسلمان تھے جن کے فلسفے، منطق اور طب کی کتابیں ابھی تک پڑھ رہے ہیں؟ تو جدید علوم و فنون نہ سیکھ کر ہم مسلمانوں کا کتنا نقصان کر رہے ہیں اور برٹش نوآبادیاتی کلچر کو ختم نہیں کر سکے نہ اسلامی قانون لاسکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری راہ مستقیم کی طرف رہنمائی کرے اور ہمارا حامی و ناصر ہو۔

دینی جماعتوں اور تحریکوں کی انارپرستی

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ عرصے سے البرہان میں دینی سیاسی جماعتوں، دینی مدارس اور دینی تحریکوں اور اداروں کو اپنے کام کو موثر بنانے کے حوالے سے مشورے دیتے رہتے ہیں۔ بعض دوسرے احباب (مثلاً پروفیسر ملک محمد حسین صاحب اور محمد رشید صاحب) بھی اس کار خیر میں حصہ لیتے رہتے ہیں لیکن آپ ہی بتائیے کہ ان جماعتوں اور اداروں نے کبھی آپ لوگوں کے کسی مشورے کو توجہ سے سنا ہے؟ کبھی آپ کی ان تجاویز پر عمل درآمد کے حوالے سے آپ سے ڈائیلاگ کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ہماری بیوروکریسی اور حکمران خواہ مخواہ بدنام ہیں، ہماری ان دینی سیاسی جماعتوں اور دینی اداروں کے قائدین کی گردنوں میں بھی سر یا کچھ کم نہیں ہے؟ یہ اپنے آپ کو عقل کل اور اپنے طریق کار کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔ تکبر، انانیت، فرقہ پرستی اور جماعت پرستی نے ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں چھوڑی کہ یہ اپنی رائے سے ہٹ کر کوئی دوسری کام کی بات سوچ سکیں یا کسی کے مشورے پر کان دھر سکیں۔ ان کے مریدوں، کارکنوں اور خوشامدیوں نے ان کو اس طرح بانس پر چڑھا رکھا ہے کہ یہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اہلیت کھو بیٹھے ہیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ جاسکتی ہے کہ وہ انہیں ہدایت سے نوازے۔ اگرچہ ان کے بگاڑ کے پیش نظر توقع نہیں کہ یہ سنبھلیں گے اور اپنی ناکامیوں سے کچھ سبق سیکھیں گے۔

پروفیسر طارق بٹ، کراچی

طالبان، جہاد اور تعلیم

ماہنامہ البرہان کے شمارہ فروری میں آپ کے خیالات پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سچ بات یہ ہے کہ احساس تنہائی کم ہوا ہے۔ نظریاتی محاذ پر اس وقت سیکولر، روشن خیال اور لبرل چھائے ہوئے ہیں۔ اسلام پسندوں کی اکثریت بھی ”مفادونگ“ میں شامل ہو چکی ہے اور ماضی کے نامی گرامی نظریاتی اسلام پسند دانشور آج کل حق اور باطل کا آمیزہ بلکہ مرکب بنا کر قوم کو پلارہے ہیں۔ ان حالات میں آپ کی طرف سے ایک خالص نظریاتی اور وہ بھی اسلامی موقف کھل کر پیش کرنا، یقیناً ہم جیسے افراد کے لیے بڑی تقویت کا باعث بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

”تعلیم اور افغان طالبان“ کے عنوان سے آپ نے جو مضمون شائع کیا ہے، اس بارے میں اتنا ہی عرض ہے کہ سیکولر روشن خیال پراپیگنڈے کی تحریک میں کذب بیانی بلکہ نوسر بازی کی تمام حدود کو پار کر چکے ہیں۔ ان کی نوسر بازی پر کوئی افسوس نہیں ہوتا، دکھ ان اسلام پسندوں کے رویے سے ہوتا ہے جو سیکولر روشن خیالوں کے پراپیگنڈے کے سحر میں گرفتار ہو کر اہل ایمان کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کا بھی کوئی خیال نہیں رکھتے۔ طالبان کے تعلیم دشمن ہونے کا پراپیگنڈہ بھی نوسر بازی ہے۔ صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ ایڈورڈ گیرارڈٹ اینڈ جونا تھن والٹر نے ”افغانستان“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب طالبان کی تعلیم دشمنی پر ہی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں جو تعلیمی اعداد و شمار دیے گئے ہیں، ایسا لگتا ہے دونوں مصنفین نے انہیں پڑھا نہیں، اگر وہ پڑھ لیتے تو کبھی نہ دیتے کیونکہ یہ اعداد و شمار ساری کتاب کو غلط ثابت کر دیتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق طالبان کے دور حکومت کے سال 2000ء میں طلبہ کے داخلوں میں 9 فیصد اضافہ ہوا جبکہ اسی سال طالبات کے داخلوں میں 12 فیصد اضافہ ہوا۔

ملک احمد سرور

(مدیر ماہنامہ چشم بیدار و ریزینڈنٹ ایڈیٹر ماہنامہ آفاق کینیڈا)

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع بھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زراعت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام..... پتہ.....
..... فون.....

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 136 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

عمر خالد خراسانی کا خط سراج الحق پشاور کی نام محمد امین لاہوری کی بھی سن لیجیے

تحریک طالبان پاکستان کے ایک اہم رہنما جناب عمر خالد خراسانی نے جناب سراج الحق صاحب کو جماعت اسلامی پاکستان کا امیر منتخب ہونے پر تہنیت کا خط لکھتے ہوئے انہیں باور کرایا ہے کہ جمہوری جدوجہد سے پاکستان میں شریعت نافذ نہیں ہو سکتی اور یہ کہ اس کے لیے مسلح جدوجہد کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم جناب عمر خالد خراسانی صاحب کے اس موقف سے متفق ہیں کہ پاکستان میں مردوجہ جمہوری جدوجہد کے ذریعے شریعت نافذ نہیں ہو سکتی لیکن اس کے باوجود ان کے موقف اور خود جماعت اسلامی کے موقف میں اتنی غلطی ہائے مضامین موجود ہیں کہ ان کے تذکرے کے بغیر ہم قارئین پر یہ واضح نہیں کر سکیں گے کہ پاکستان میں غلبہ دین کا صحیح طریق کار کیا ہے؟

۱- ایک بات ابتداء ہی میں پیش نظر رہے کہ جمہوری جدوجہد اور پڑامن جدوجہد مترادف نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ معاشرے میں غلبہ دین کے صرف دو طریقے ہیں ایک جمہوری جدوجہد اور دوسرے نفاذ شریعت بذریعہ مسلح جدوجہد۔ اور چونکہ جمہوری نظام کے ذریعے پچھلے ۶۶ سال میں پاکستان میں شریعت نافذ نہیں ہو سکی لہذا اب اس کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے اور وہ مسلح جدوجہد کا ہے۔ بلکہ مسلح جدوجہد کے بالمقابل پڑامن جدوجہد ہے جس کی مغربی جمہوریت کے علاوہ بھی کئی صورتیں ممکن ہیں جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔

۲- یہ تصور بھی تصحیح طلب ہے کہ شریعت کوئی ایسی چیز ہے جسے صرف اقتدار کی قوت ہی سے نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دین تو ہے ہی اسلام اور ہم تو ہیں ہی مسلمان یعنی وہ لوگ جو اپنی مرضی سے اپنا سر تسلیم اللہ کے حضور خم کرتے ہیں اور بلا شرط و بلا حدود اللہ کی عبادت و اطاعت کا دم بھرتے ہیں لہذا کسی مسلمان کو نہ یہ زیبا ہے اور نہ اس کا حق ہے کہ اللہ کی عبادت و اطاعت سے منہ موڑے۔ لہذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے اور جب مسلم معاشرہ وجود میں آجائے تو اجتماعی سطح پر بھی جہاں تک ہو سکے اسلامی تعلیمات پر اپنی داخلی خواہش و رغبت سے عمل پیرا ہو۔ اور اگر اس کے بعد مسلمانوں کی اپنی ریاست و حکومت ہو تو اس میں بھی اسلامی تقاضوں پر عمل کرے اور قوت نافذہ سے مسلمانوں کو اس قابل کرے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی

میں اسلامی تعلیمات پر عمل کریں۔

مسلمانوں کو فرد، معاشرہ اور ریاست کی ان تینوں سطحوں پر اسلام پر عمل کے قابل بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعے جو طریق کار عطا فرمایا ہے وہ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ کا طریقہ ہے۔ یعنی کتاب اللہ کی تعلیم اور تعلیم حکمت کے ذریعے نفوس کا اس طرح تزکیہ کیا جائے کہ اللہ کی عبادت و اطاعت ان کے لیے سہل و مرغوب ہو جائے۔ اس اصول پر اگر فرد کو تیار کر دیا جائے تو وہ نہ صرف اپنی ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر برضا و رغبت عمل کرے گا بلکہ معاشرے اور ریاست کی سطح پر اجتماعی زندگی میں بھی خوشی سے اسلامی احکام پر عمل پیرا ہو جائے گا۔

۳۔ اسلام اعلاء کلمۃ اللہ کا متقاضی ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کا جدوجہد کرنا واجب ہے بلکہ یہ جدوجہد (یعنی جہاد) اسلام میں چوٹی کا عمل ہے لیکن اکثر لوگ بھول جاتے ہیں کہ قتال صرف اس کے آخری مرحلے کا نام ہے اور اس کے باقی سارے مراحل پر امن ہیں۔ نفس کے خلاف جہاد کہ وہ اللہ کی عبادت و اطاعت کرے، دین کی نشر و اشاعت، تعلیم و تدریس، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دعوت و تبلیغ و اصلاح اور ان کاموں کے لیے زبان، قلم اور مال سے جدوجہد اور ہر نوع کی مشقت یہ سب جہاد ہی ہے۔ قتال اصلاً یا تو دین کے دفاع کے لیے ہوتا ہے یا اعلاء کلمۃ اللہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے۔ یہ مسلمانوں کے آپس میں لڑنے مرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مسلمان انفرادی یا اجتماعی زندگی میں اسلامی تقاضوں کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوتا تو اسے محبت و خیر خواہی سے سمجھانے اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ اس کے سر پہ تلوار سونپنے کی۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں جو جنگیں ہوئیں ان پر بہت سے صحابہ دل گرفتہ تھے اور اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ کی مظلومانہ شہادت اور شکست سے مسلمانوں نے یہ سبق سیکھا کہ مختلف طرح کی کمزوریوں کے باوجود امت کے سیاسی نظام کو چیلنج کرنے کی بجائے سسٹم کے اندر رہ کر اس کی پر امن اصلاح کی کوشش کی جائے چنانچہ جب تک خلافت کا برا بھلا نظام ۱۹۲۴ء تک باقی رہا مسلمان علماء و فقہاء نے کبھی اس کے خلاف بغاوت و جہاد کا فتویٰ نہیں دیا۔

۴۔ مسلمان جب اپنے ایمان و عمل میں کمزوری کی وجہ سے رو بہ زوال تھے تو ان کے حریف اہل مغرب نے انہیں دبوچ لیا، ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا، انہیں کچلا، لوٹا، ان کے اجتماعی ادارے تباہ کر دیے اور پورا نظام زندگی اپنی فکر و تہذیب پر کھڑا کیا اور مسلمانوں کو فکری طور پر غلام بنائے رکھنے کے لیے کامیاب کوششیں کیں۔ پھر جب انہیں مجبوراً مسلم ممالک کو آزادی دینا پڑی تو انہوں نے اقتدار ان سیاستدانوں، سول اور فوجی بیوروکریسی..... کو منتقل کیا جو ان کے پروردہ اور ان کی فکر و تہذیب سے مرعوب

و متاثر تھے۔ چنانچہ کسی اسلامی ملک میں ماضی کی خلافت یا اجتماعی اسلامی اداروں کا احیاء نہ ہو سکا بلکہ سارے اسلامی ممالک میں اہل مغرب کا سیاسی نظام (نیشنلزم و جمہوریت)، ان کا معاشی نظام (سود پرستی، سرمایہ دارانہ نظام)، ان کا تعلیمی نظام، ان کا قانونی نظام..... معمولی کتر بیونت سے رائج چلا آ رہا ہے۔ اس کے باوجود جب کچھ مسلم ممالک نے سر اٹھایا تو اہل مغرب نے پھر قوت سے ان کا سر کچل دیا۔ عراق، افغانستان، لیبیا میں انہوں نے اپنی مرضی کی حکومتیں بحیر قائم کر دیں۔ یمن، شام، پاکستان، مالی پر حملے جاری ہیں اور فلسطین، کشمیر، چیچنیا، ترکستان، داغستان..... میں مسلمان اپنے وجود کی بقاء کے لیے اہل مغرب اور ان کے حلیفوں سے مصروف جہاد ہیں۔

۵۔ پاکستان میں اہل مغرب کی پلاننگ اور عملی مداخلت کی وجہ سے اقتدار ہمیشہ ان لوگوں کے پاس رہا جو اپنا ملک ان کی مرضی اور ان کی تہذیب کے مطابق چلانے پر تیار تھے چنانچہ سارا نظام زندگی آج بھی انگریز کے بنائے ہوئے ڈھانچے کے مطابق چل رہا ہے۔ عوام اور دینی قوتوں کے مطالبے پر اگر کچھ اسلامی چیزیں مان بھی لی گئی ہیں تو ان پر عمل درآمد نہیں ہوا اور پولیس، فوج، عدلیہ، انتظامیہ، میڈیا..... سب کی تربیت اس طرح کی گئی ہے کہ ان میں سے کوئی ادارہ اور اس کے افراد اسلامی نظام حیات پر عمل کے لیے تیار نہیں گوز بانی کلامی اور کاغذی کارروائی کی حد تک اسلام زندہ باد کے نعرے خوب لگائے جاتے ہیں اور آئین و قوانین میں اسلام خاصی حد تک موجود ہے۔

۶۔ مسلم ممالک میں جہاں بھی اسلامی قوتوں نے سر اٹھایا اور اسلام کو اپنے احیاء کی بنیاد بنانا چاہا، مغربی قوتوں نے انہیں یا تو حیلے بہانے اور پرکاری سے ان کے کچھ معصوم مطالبے مان کر انہیں جمہوریت کے راستے پر ڈال دیا اور منصوبہ بندی اور سازشوں سے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا اور اگر وہ رکاوٹوں کے باوجود کامیاب ہو گئے تو انہیں حکومت نہیں کرنے دی گئی اور فوج کے ذریعے ان کو کچل دیا گیا جیسا کہ ماضی میں الجزائر اور فلسطین میں اور حال ہی میں مصر میں ہوا ہے اور جہاں مجبور ہو کر دینی قوتوں نے ہتھیار اٹھائے وہاں انہیں مخالفین اور فوج کی مدد سے کچل دیا جیسا کہ انڈونیشیا، شام، لیبیا، مصر، ناٹجیر یا اور دوسرے بہت سے ممالک میں ہو چکا ہے۔

اس میں استثنائی کامیابی اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے صرف افغان مجاہدین کے حصے میں آئی جنہوں نے بے مثال قربانیاں دے کر پہلے روس جیسی سپر پاور کو اور اب امریکہ و یورپ کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ انہیں آئندہ کے مراحل میں بھی نصرت و کامیابی سے نوازے، آمین یا رب العالمین۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ تمہید طولانی ہوگئی۔ اب آئیے عمر خالد خراسانی اور سراج الحق صاحب کے موقف کی طرف۔

ہم اگر جان کی امان پائیں تو ادب کے ساتھ دونوں سے ایک سوال کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی جماعتوں نے منہج انبیاء کے مطابق تعلیم کتاب و حکمت و تزکیہ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے مسلمان عوام و خواص کی اصلاح اور انہیں اور اچھا باعمل مسلمان بنانے کے لیے یا بالفاظ دیگر فرد کی تعمیر شخصیت و کردار اور معاشرے کی اصلاح کے لیے کیا کوششیں کی ہیں؟ دس سال طالبان پاکستان کو مسلح جدوجہد کرتے ہو گئے کیا اس سے پہلے زیادہ نہیں صرف دس سال انہوں نے فرد و معاشرے کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور عمل کرنے کے لیے تیار کرنے پر لگائے تھے؟ اور ۶۶ برس پاکستان کو بنے ہو گئے اور سراج الحق صاحب کی جماعت نے شروع ہی سے سیاسی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ سوال یہ ہے کہ سیاسی جدوجہد کے اثرات سمیٹنے سے پہلے لوگوں کو اچھا مسلمان بنانے اور اسلام کی حمایت میں ان کی تعلیم و تربیت اور اصلاح معاشرہ کے لیے انہوں نے کتنے سال جدوجہد کی؟

ہم نہایت ادب سے پوچھتے ہیں کہ جب مجاہدین نے پرامن جہاد کے ذریعے تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ اور عوام و خواص کے دل و دماغ کو اسلام کے مطابق بدلنے کی جدوجہد ہی نہیں کی تو ان کو جہاد بمعنی قتال کا حق کیسے پہنچتا ہے؟ اور سراج الحق صاحب کی جماعت نے جب پاکستان میں اصلاح فرد و معاشرہ کے لیے آج تک اگر جم کر کام ہی نہیں کیا تو وہ عوام کے ووٹوں کی طاقت سے کامیاب ہو کر غلبہ دین کے خواب کیوں دیکھتی ہے؟

اگر اہل جماعت کہیں کہ وہ یہ کام کرتے رہے ہیں تو یہ بدابنا غلط ہے کیونکہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۸ء میں ترجمان القرآن میں اعلان کیا تھا کہ ہم اصلاح معاشرہ کا اصل طریقہ چھوڑ کر سیاسی جدوجہد کا طریقہ اس لیے اپنا رہے ہیں کہ تحریک پاکستان میں قوم اور مسلم لیگ نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا وعدہ کیا ہے اور یہ کہ ہم اس میں کامیاب نہ ہوئے تو واپس اصلاح فرد و معاشرہ کے طریقے پر کام کی طرف پلٹ جائیں گے۔ رجب صدی تک اس منہج پر کام کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شکست کے بعد مولانا مودودیؒ نے اصلاح فرد و معاشرے کے منہج کی طرف واپس لوٹنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن جماعت نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

ہم عمر خالد خراسانی صاحب اور ان کے ساتھیوں کے غور و فکر کے لیے چند باتیں اور بھی عرض کرنا چاہتے ہیں:

۱- کیا انہوں نے کبھی غور کیا ہے کہ طالبان افغان کا ہدف کفار یعنی امریکہ اور اس کے حلیف ہیں لیکن طالبان پاکستان کا ہدف کفار کیوں نہیں بنے اور ان کا ہدف پاکستان کیوں ہے؟ جب کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کی مسلح جدوجہد شروع ہی اس وقت ہوئی جب امریکہ و نیٹو نے افغانستان پر حملہ کیا اور پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ قبائل کو جہاد افغانستان میں حصہ لینے سے روکے ورنہ وہ خود ان پر زمینی حملہ کر دے گا۔

۲- ہمیں تسلیم ہے کہ تحریک طالبان پاکستان میں بہت سے لوگ مخلص ہیں اور وہ اللہ کے لیے لڑ رہے ہیں لیکن اس امر سے انکار بھی ممکن نہیں کہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے کئی تنظیمیں اور گروپ بنا رکھے ہیں جو نام تو طالبان اور شریعت کا لیتے ہیں لیکن کام امریکہ، یورپ اور بھارت کے لیے اور پاکستان کے خلاف کرتے ہیں تاکہ پاکستان کمزور ہو جائے اور ٹوٹ جائے۔

۳- افغانستان کے مخصوص حالات تھے، اور وہاں اصلاً جہاد کفار کے خلاف تھا..... لیکن افغانستان کے علاوہ کسی اسلامی ملک میں آج تک کوئی ایسی جماعت کامیاب نہیں ہوئی جس نے نفاذ اسلام کے لیے مسلح جدوجہد کی ہو لہذا آپ کے کامیاب ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں کیونکہ آپ کے حالات افغانستان جیسے نہیں اور امریکہ و نیٹو کے افغانستان سے جانے کے بعد آپ کے لیے حالات مزید کٹھن ہو جائیں گے لہذا ہم نہیں چاہتے کہ طالبان پاکستان مزید جانی قربانی دیں۔

۴- اس میں شک نہیں کہ خرابی کی جڑ پاکستان کے حکمران طبقے ہیں جو امریکہ و یورپ کی اشریاد پر اور حب دنیا اور حب جاہ و مال کے لیے پاکستانی معاشرے اور ریاست کو اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں چلا رہے لیکن اس کے لیے ہماری دینی قوتوں نے پرامن جدوجہد کا حق ادا ہی نہیں کیا یعنی تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کے لیے بھرپور جدوجہد نہیں کی اس لیے اسلام کے حق میں نہ سیاسی جدوجہد کی کامیابی کا امکان ہے اور نہ مسلح مزاحمت کا اور نہ امریکہ و یورپ اور ان کے حلیف اور مقامی حمایتی انہیں کامیاب ہونے دیں گے اور اگر وہ یہ کام کر لیتے یعنی تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کا تو لوگوں کی زندگیوں اور معاشرے میں اسلام آچکا ہوتا اور ان کا مقصد بڑی حد تک حاصل ہو چکا ہوتا اور اس عوامی حمایت اور قوت کے سامنے ریاست بھی زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں نہ کر سکتی۔

اسی لیے ہم طالبان پاکستان اور حکومت پاکستان کے مابین مذاکرات کے حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ مذاکرات کامیاب ہوں اور طالبان نے آج تک جو جدوجہد کی ہے اسے وہ نفاذ شریعت کی شکل میں زیادہ سے زیادہ کیش کرالیں۔ خدا خواستہ اگر ایسا نہ ہو سکا تو اس کا ان کو کبھی نقصان ہوگا اور پاکستان کو بھی

اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمن خوش ہوں گے۔

تلخیص مباحث

ہم نے سطور بالا میں جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خراسانی صاحب کی تحریک نفاذ شریعت کے لیے مسلح جدوجہد کر رہی ہے اور سراج الحق صاحب کی جماعت غلبہ دین کے لیے جمہوری سیاسی جدوجہد کر رہی ہے لیکن دونوں نے تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کے اس منہج پر جم کر کام نہیں کیا جو قرآن کی رو سے منہج انبیاء ہے یعنی تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس لہذا دونوں کی کامیابی محذوش ہے۔ انہیں اور دوسری دینی قوتوں کو چاہیے کہ وہ اس پیغمبرانہ منہج کے مطابق کام کرنے کی طرف لوٹ آئیں اور ایک معقول مدت تک اس پر کام کرنے کے بعد اس کے نتائج و اثرات سیاسی و اجتماعی زندگی میں سمیٹنے کا سوچیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے، جنہیں لوگ حکیم الامت کہتے ہیں، ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اگر مجھے حکومت مل جائے تو (حدود وغیرہ نافذ کرنے سے) پہلے دس سال تک لوگوں کی اصلاح کروں گا (تا کہ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں شریعت پر عمل کرنے کے لیے برضا و رغبت اور ذہناً و قلباً آمادہ ہو جائیں) لیکن یہ عجیب لوگ ہیں جو تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کا کام کیے بغیر مغربی طرز کی جمہوری جدوجہد کے ذریعے غلبہ دین کے خواب دیکھتے ہیں اور مسلح جدوجہد کے ذریعے کفار کا مقابلہ کرنے کی بجائے گنہگار مسلمانوں کو مار کر شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں جب کہ معاشرے کے عوام و خواص پر نہ انہوں نے محنت کی ہے اور نہ وہ ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔

ہمیں تحریک طالبان پاکستان اور جماعت اسلامی کے مقاصد سے اتفاق اور ان کی جدوجہد سے ہمدردی ہے اس لیے ہماری درخواست ہے کہ ان خیر خواہانہ جذبات کو مخلصانہ گزارشات و تجاویز سمجھا جائے اور اسے تنقید و مخالفت نہ گردانا جائے۔

آخری بات یہ کہ عمر خالد خراسانی صاحب تحریک طالبان کے لیڈر ہیں اور سراج الحق صاحب جماعت اسلامی کے قائد جبکہ ان سطور کے راقم کے پاس اخلاص، برسوں کے غور و فکر اور تدبیر و تالیف کے سوا کوئی متاع نہیں..... لیکن اگر وہ حزبی تعصب سے بالاتر ہو کر معروضیت اور دردمندی سے اس اصول کو پیش نظر رکھیں کہ ”یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے اور یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے“ اور غور و فکر کریں تو پھر ان کو ہماری گزارشات میں وزن محسوس ہوگا، ان شاء اللہ۔

هذا من عندنا والعلم عند الله

قارئین البرہان کے نام

✉ جن اصحاب نے ایک دفعہ سالانہ چندہ بھجوا یا جو ختم ہو گیا لیکن پرچہ اب بھی ان کو مل رہا ہے۔ وہ اگلے سال کے لیے زراعت بھجوادیں یا ہو سکے تو تاحیات خریدار بن جائیں۔

▣ اگر آپ کے پاس پرچہ اعزازی آتا ہے اور آپ کو پسند ہے اور آپ مالی وسعت رکھتے ہیں تو ۴۰۰ روپے سالانہ زراعت اس زمانے میں کوئی بڑی بات نہیں، بھجوادیں تاکہ انتظامیہ پر مالی بوجھ کم ہو۔

▣ اگر آپ خوشحال ہیں اور پرچہ آپ کو پسند ہے تو ۵۰۰ روپے بھجوا کر تاحیات خریدار بن جائیں۔ اگر آپ کاروبار، تجارت یا مارکنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں تو البرہان کو اشتہار دیکھنے یا دلوائیے۔

▣ اگر پرچہ آپ کو اعزازی طور پر ملتا ہے اور آپ کی دلچسپی اور پسند کا نہیں تو ازراہ نوازش خط، SMS، ای میل یا فون کے ذریعے مطلع فرمادیں تاکہ اس کی ترسیل بند کر دی جائے۔

▣ اگر آپ مالی طور پر کمزور ہیں لیکن البرہان پڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مطلع کیجیے، ہم پرچہ آپ کے نام جاری کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ ۴۰۰ روپے سالانہ ادا کر سکتے ہیں تو پرچہ فری نہ منگوائیے، خرید کر پڑھیے۔

❧ البرہان کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیے، خود خرید کر پڑھیے، دوسروں کو خریدنے کی ترغیب دیجیے، دوسروں کو خرید کر دیجیے۔ اس کی انجمنی لیجیے۔ اس کے تاحیات خریدار بنیے۔

✉ مدیر البرہان کی کتابیں بلا معاوضہ مانگ کر شرمندہ نہ کیجیے۔ تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ اتنی مالی سکت نہیں رکھتا کہ کتابیں طبع اور تقسیم کرے۔ ہم قارئین کی سہولت اور اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے صرف اتنا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی جو کتابیں مختلف پبلشرز نے طبع کی ہیں، وہ خرید کر طلب کرنے والوں کو بھجوا دیتے ہیں۔ اگر آپ کو ٹرسٹ کے مقاصد سے دلچسپی ہے تو کتابوں کی طباعت و تقسیم میں ادارے سے مالی تعاون فرمائیے۔

عبدالحمید

(سرکولیشن مینیجر)

نسل نو پر مغربی تعلیم کے اثرات انگلش میڈیم سکولوں کے نصابات کا ایک جائزہ

کراچی میں ERDC تعلیم و تدریس سے متعلق مشاورت کا ایک معروف ادارہ ہے۔ اس کے سربراہ جناب سلمان صدیقی اور ان کے رفیق کار جناب زیر شیخ صاحب نے ڈاکٹر عبدالوہاب سوری اور راقم الحروف کو دعوت دی کہ وہ کراچی کے چند اہم ترین اسکولوں کے مالکان، منتظمین، مہتمم، مدرسین اور بھی خواہوں کی ایک خصوصی نشست میں شرکت کریں اور ان کے اسکولوں کو درپیش مسائل اور ان اداروں سے فارغ ہونے والی نوجوان نسل کے بارے میں ان کے زرین خیالات، سوالات، شبہات، اشکالات، اضطراب اور ابہامات براہ راست سنیں۔ ہم دونوں نے اس فکر انگیز نشست میں شرکت کی اور اسکولوں سے وابستہ نہایت مخلص، دین دار، صاحب ایمان خواتین و حضرات کے خیالات سنے۔ ان سب کا مشترکہ موقف یہ تھا کہ ہم اپنے اسکولوں میں اسلامی طرز زندگی، اسلامی تعلیمات، اخلاقیات، تجوید قرآن، حدیث، سب کچھ کا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود نتائج حوصلہ افزاء نہیں ہیں۔ ہمارے اسکولوں سے فارغ ہونے والے بچوں کا آئیڈیل مغرب ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے بہت زیادہ متحرک ہوتے ہیں اور ان کو منزل پاکستان سے باہر ہی نظر آتی ہے ہم اس مسئلے کو کیسے حل کریں؟ ہمارے بہترین ماحول اور بہترین اسلامی تربیت کے باوجود بچوں میں یہ خیالات کیوں پیدا ہو جاتے ہیں؟

یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب طویل ہے مختصر نہیں۔ جدید اسکول کا نظام کہاں سے آیا ہے اس کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟ اس کے مقاصد و اہداف کیا ہیں؟ اس کا نصاب کس بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے؟ اس کی تاریخ کیا ہے اور ان اداروں کے قیام کے لیے جبر کیوں کیا گیا؟ بچے پر نماز سات سال میں فرض ہوتی ہے لیکن اسکول میں بچے کا داخلہ اس وقت کیوں ہو جاتا ہے جب وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے؟ خدا کی عبادت بچہ سات سال میں شروع کرتا ہے مگر معدہ اور معاش کی عبادت ماں کے پیٹ سے شروع کر دیتا ہے آخر کیوں؟ یہ جبر لوگوں کے لیے اس قدر فطری، حقیقی اور قابل قبول کیوں ہے

قرآن نے حکم دیا ہے مائیں مکمل دو سال تک بچوں کو دودھ پلائیں مگر اس عمر سے بھی پہلے بچے کو مونگیری میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ جبر کون مسلط کر رہا ہے؟ جدید سیکولر تعلیم کے اساسی مفکرین روسو [Rousseau]، مل [Mill]، ولیم جیمز [William James] جان ڈیوی [John Dewey]، گیٹوز [Gatos] اور فوکالٹ [Foucault] نے اس موضوع پر کیا لکھا ہے؟ کیا جدید تعلیمی نظام کے ہتھیار ابلاغ عامہ کے اوزار ہیں یا تباہی و بربادی کے آلات [The weapons of Mass Instruction or Mass Destruction]، ان فلسفیانہ مباحث کو ایک نشست یا ایک مضمون میں بیان کرنا محال ہے لیکن اس سوال، تشویش اور فکر مندی کا مختصر سا جواب دینے کے لیے راقم الحروف نے انگریزی اسکولوں میں پڑھائی جانے والی دو اہم کتابوں کے بعض مضامین، کہانیوں کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے ممکن ہے اس جائزے میں ان سوالوں کا کوئی جواب مل سکے۔ روشنی کی ایک لکیر بھی گھپ تاریک رات میں ہزاروں چراغوں کا متبادل ہوتی ہے۔ اس جائزے کو ایسی ہی ایک لکیر سمجھیے۔

Nutty as Noodle Stories

کراچی کے وہ اسکول جہاں Adexcle System کے تحت تعلیم دی جاتی ہے تیسری جماعت کے بچوں کو انگریزی ادب کی تعلیم دینے کے لیے ایک کتاب Nutty as Noodle stories کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے یہ کتاب بھارت، ایشیا اور پوری دنیا میں پڑھائی جاتی ہے۔ Pie Corbett کی کتاب کی پہلی کہانی کا عنوان ہے Daft Jack، جمن، نادان، بدھو جیک۔ جیک ایک غریب ماں کا بیٹا تھا جو گھروں میں کام کر کے اپنی گزراوقات کرتی مگر اس کا بیٹا روزانہ صبح کے وقت گھر کے دروازے پر بیٹھ جاتا اور گھاس چباتا۔ سہ پہر کو وہ ندی پہ بیٹھ کر مچھلیوں سے دل بہلاتا اور رات کو تاریک آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو ٹنگی باندھ کر دیکھتا رہتا، یہی اس کی مصروفیت تھی۔ ایک دن اس کی ماں نے اس سے کہا کہ یہ سستی، بکمال ختم کرو اور کام کے لیے نکلتا کہ اپنی خوراک کا بندوبست کر سکو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو واپس اس گھر کا رخ نہ کرنا۔ اگلے دن نادان جیک کام کی تلاش میں نکلا اس کی ملاقات ایک کسان سے ہوئی اس نے کسان کا ہاتھ بٹایا شام کو کسان نے اس کی شدید محنت کے معاوضہ میں ایک پیٹی کا سکہ دیا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ آج تو میری ماں بہت خوش ہوگی۔ واپسی کے سفر میں وہ ندی کے پاس رکا اور مچھلیوں کا نظارہ دیکھنے ندی پر جھکا۔ اس کے ہاتھ میں رکھا ہوا سکہ ہاتھ سے پھسل کر ندی

میں جاگرا وہ سکے کی تلاش میں ندی کی تہہ تک اتر اگھر سکھ ہاتھ نہ آیا وہ مایوس ہو کر گھر کی طرف چلا اسے یقین تھا کہ اس کی ماں سکے کی گمشدگی کا سن کر بالکل خوش نہیں ہوگی وہ مچھلی کی طرح پانی میں تر بہ تر تھا دن بھر کی محنت کا ثبوت ماں کے سامنے پیش کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا ماں اسے دیکھتے ہی چلائی اواحق لڑکے تمہیں سکھ اپنی جیب میں رکھنا چاہیے تھا۔ جیک نے جواب دیا امی معاف کر دیجیے اگلی مرتبہ غلطی نہیں ہوگی میں اس نصیحت کو یاد رکھوں گا۔ اگلے دن وہ کام کے لیے نکلا تو اسے ایک کسان ملا جس کے پاس گاؤں کا گلہ تھا اس نے کسان کا ہاتھ بٹایا۔ شام کے وقت کسان نے اس کی مشقت کے صلے میں اسے دودھ کا ایک جگ دیا۔ جیک کو ماں کی نصیحت اور اپنا وعدہ یاد تھا لہذا اس نے نہایت احتیاط اور ذمہ داری سے دودھ کا جگ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج اس کی ماں بہت خوش ہوگی لیکن گھر پہنچتے پہنچتے دودھ جیب سے بہہ کر اس کی ٹانگوں سے رسنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی ماں ہرگز خوش نہیں ہوگی اس کی پتلون دودھ سے تر بہ تر ہو رہی تھی اور دن بھر اس نے جو مشقت کی تھی اس کا ثبوت دکھانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا بس یہی دودھ سے گیلی پتلون تھی۔ ماں اسے دیکھتے ہی چلائی اے احمق تمہیں دودھ کے جگ کو اچھی طرح ڈھانک کر اپنی قمیض کے اندر رکھ کر لانا چاہیے تھا۔ (You should have wrapped up the jug and carried it under your shirt) جیک نے پھر معذرت پیش کی اور کہا کہ آئندہ میں اس بات کا خیال رکھوں گا (سوال یہ ہے کہ بچہ احمق ہے یا ماں بھی احمق ہے۔ دودھ کے جگ کو قمیض کے اندر رکھ کر کیسے لایا جاسکتا ہے؟) اگلے دن جیک پھر کام کی تلاش میں باہر نکلا۔ اسے نان بائی ملا اس نے روٹی کے لیے آٹا گوندھنے کا کام اس کے سپرد کیا۔ شام کے وقت جیک کی سخت محنت مشقت کے معاوضے میں نان بائی نے اسے بلی کا ایک بچہ دیا۔ جیک کو ماں سے کیا گیا اپنا وعدہ یاد تھا اس نے بلی کے بچے کو نہایت احتیاط سے لپیٹ کر اپنی قمیض کے اندر رکھ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو اس کی ماں ضرور اس سے خوش ہوگی لیکن بلوگٹر قمیض کی اندھیری کال کوٹھری میں ناخوش تھا۔ اسے جیک کی قمیض کے اندر رہنا نہایت مضحکہ خیز لگا۔ بلوگٹر نے غریب جیک کو بچے مار مار کر لہو لہا کر دیا۔ اس سے پہلے کہ جیک گھر پہنچتا بلوگٹر اچھلانگ مار کر راستے میں ہی بھاگ نکلا۔ جیک کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کی ماں بہت ناراض ہوگی۔ ماں نے جیک کو جیسے ہی دیکھا چلائی اوگدھے لڑکے بلوگٹر کے رسی کے ٹکڑے کے ساتھ باندھنا چاہیے تھا پھر تم اسے اپنے ساتھ ساتھ چلا کر لے آتے۔ جیک نے حسب معمول معذرت پیش کی اس نصیحت کو یاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اگلے دن وہ پھر کام کی

تلاش میں نکلا اسے قصائی نے کچھ کام دیا شام کے وقت اس کی محنت کے معاوضے میں قصائی نے اسے گوشت کا ٹکڑا دیا جیک کو ماں کی نصیحت اور اپنا وعدہ یاد تھا۔ اس نے ایک رسی کو گوشت کے گرد لپیٹا اور گوشت کو بلی کے بچے کی طرح رسی سے کھینچتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو اس کی ماں یقیناً خوش ہوگی۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ بہت سے کتے اس کا پیچھا کرنے لگے وہ گوشت کھانا چاہتے تھے وہ تمام راستے گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہے جب جیک گھر پہنچا تو رسی کے آخری سرے پر کچھ نہیں بچا تھا اور اس کے ٹخنے زخمی ہو گئے تھے۔ اس نے جان لیا کہ اس کی ماں ہرگز خوش نہیں ہوگی۔ جیسے ہی ماں نے جیک کو دیکھا زور سے چلائی احمق گوشت اپنے کندھے پر رکھ کر لانا چاہیے تھا تاکہ کتے گوشت نہ کھا سکتے (You should have carried the meat on your shoulders then the dogs would not have been able to eat it.) اس کی عقل مند ماں کا یہ مشورہ خود احمقانہ ہے کیا گوشت کندھے پر رکھ کر لایا جاتا ہے؟ (جیک نے حسب معمول معذرت کی ماں کی نصیحت کو اپنے پلے باندھنے اور اس پر عمل کا وعدہ کیا۔ اگلے دن وہ کام کی تلاش میں نکلا اسے شہد جمع کرنے والا ملا جیک نے چھتوں سے اس کے لیے شہد جمع کیا دن کے اختتام پر شہد والے نے اسے اپنا بوڑھا نا کارہ گدھا سخت محنت کے معاوضے میں دیا جیک نے گدھا لیا اور ماں کی نصیحت اور اپنے وعدہ پر عمل کرتے ہوئے گدھے کو اپنے کا ندھے پر اٹھالیا اور گھر کی طرف چل دیا گدھے کی ٹانگیں ہوا میں لہرا رہی تھیں جیک اسی حالت میں چلتا رہا اور گدھا زوردار طریقے سے ڈھینچوں ڈھینچوں کر رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت امیر آدمی کا گھر تھا جو اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا تھا اس کی بیٹی بہت خوبصورت تھی لیکن اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے مسلسل اداس تھی اس نے ماں کے مرنے کے بعد اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا وہ ہمیشہ غم میں ڈوبی رہتی ڈاکٹروں نے اس کے باپ کو بتایا تھا کہ وہ صرف اسی وقت کچھ بولے گی جب کوئی اسے ہنسا سکے اس غم زدہ لڑکی نے گھر سے باہر شور شرابے کی آواز سنی تو کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک پر عجیب تماشا تھا جیک کے کا ندھے پر ایک گدھا لدا ہوا تھا یہ منظر دیکھ کر اس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا اور مسرت کا چشمہ پھوٹ نکلا وہ مسلسل اور مستقل ہنسنے جا رہی تھی وہ بھاگ کر اپنے ابو کے پاس گئی اور اس پر لطف منظر کا ذکر کیا۔ لڑکی کا باپ اس واقعہ سے بے انتہا خوش ہوا کہ اس کی بیٹی نے ہنسنے ہی بولنا شروع کر دیا لڑکی کے باپ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکے کو اپنی بیٹی کا شوہر بنائے گا جس نے اس کی اداس بیٹی کو خوش کر دیا تھا۔ لڑکی کے باپ نے اپنی بیٹی جیک کے سپرد کر دی جیک گدھے پر اپنی بیوی کو

بٹھا کر گھر لے گیا اس شام بھی جیک کی ماں اس کا انتظار کر رہی تھی اس کا اندازہ تھا کہ جیک آج بھی کوئی احمقانہ کام کر کے آئے گا اور اس کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہو کر رہے گا وہ اس کو ایک زوردار سبق سنانے پر تیار تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ جیک ایک گدھالے کر آ رہا ہے اور گدھے پر ایک نہایت خوبصورت لڑکی سوار ہے تو اس کی ماں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا۔ اس دن سے جیک کی ماں نے جیک کو کبھی احمق جیک نہیں کہا۔

اس کہانی میں بچے کے لیے کئی اسباق مخفی ہیں جو ہماری تہذیب، علمیت، تاریخ، روایات اور اقدار سے متصادم ہیں:

(۱) روایتی تہذیبوں میں احمق نادان معذور بدھو بچوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی معذوری نادانی کو لعنت ملامت کا نشانہ نہیں بنایا جاتا ان سے خصوصی محبت کا سلوک کیا جاتا ہے آج بھی روایتی معاشروں میں خاندان کے سب سے کم زور، معذور اور احمق بچے کو سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اس کو تذلیل، تضحیک، تمسخر کا نشانہ نہیں بنایا جاتا کیونکہ وہ خلقی طور پر کم زور ہوتا ہے اور زندگی کی دوڑ میں صحت مند لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا ایسے بچوں کے ساتھ صرف ماں ہی نہیں خاندان اور خاندان سے باہر بھی ہر شخص خصوصی توجہ اور محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔ ان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ اور ذمہ داریاں بھی نہیں ڈالی جاتیں۔

(۲) کم زور اور احمق بچے کی خاص تربیت کی جاتی ہے اس کو پیار و محبت سے سمجھایا جاتا ہے اور اس کی غلطیوں کی اصلاح نہایت تدبیر، فہم اور شفقت سے کی جاتی ہے یہ عجیب ماں ہے جو اسے روزانہ ذلیل کرتی ہے اور بچے کو جو سبق دیتی ہے اس کے ساتھ یہ نہیں بتاتی کہ یہ سبق صرف اس طرح کی صورت حال میں کارآمد ہے لیکن تم اس سبق کو دوسری جگہوں پر استعمال نہ کرو وہ بچے کو یہ سمجھا سکتی تھی کہ جس کے یہاں کام کرو جب وہ معاوضے میں کچھ دے تو اس سے پوچھ لو کہ میں اسے کیسے لے کر جاؤں؟

(۳) ایک نادان احمق بچہ بھی اتنا احمق نہیں ہوتا کہ وہ دودھ کو جیب میں ڈال دے اور بلوگٹڑے کو قمیض کے اندر رکھ کر چھپائے جسم کے ساتھ چٹالے اور خود کو اس سے زخمی بھی کرائے۔ بچے کی حماقت انگیزی بہت زیادہ افسانوی ہے فی الحقیقت بچہ اگر اتنا ہی احمق تھا تو اس پر غصے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔

(۴) ماں نے بچے کو جو اسباق دیے وہ خود احمقانہ ہیں۔ دودھ کے جگ کو قمیض کے اندر رکھ لو، گوشت کو

کندھے پر رکھ کر لاؤ، عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا دونوں طریقے نہایت غلط ہیں۔ کہانی نویس نے ماں کو بھی احمق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۵) بچہ اتنا بے وقوف ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے کام صحیح طریقے سے نہیں کر سکتا لیکن زندگی کا سب سے مشکل کام یعنی شادی کا فیصلہ اس نے ایک لمحے میں کر لیا۔ اپنی ماں سے مشورہ بھی نہیں کیا اجازت بھی نہیں لی شادی کی تقریب بھی منعقد نہیں ہوئی خاندان کے لوگوں سے کوئی مشورہ، کوئی رائے کچھ نہیں کیا گیا۔

(۶) لڑکی کا باپ جو امیر تھا اس نے بھی یہی سوچا کہ یہ احمق لڑکا ہی میری لڑکی کو خوش رکھ سکے گا اور اس کے اشارے پر چلتا رہے گا لہذا اس نے لڑکے کے خاندان، حسب نسب کام، کاروبار، ماں باپ، رہائش کے بارے میں کچھ پوچھنے، دیکھنے، سوچنے، کی زحمت گوارا نہ کی۔ لڑکی کا باپ ایک جانب اتنا عقل مند ہے مگر اس نے اپنے کسی عزیز دوست پڑوسی سے مشورہ نہیں کیا نہ بچی کی شادی میں کسی کو مدعو کیا۔ اچانک سڑک پر جانے والے ایک نامعلوم لڑکے سے خوش ہو کر اپنی قیمتی متاع لڑکی کا ہاتھ اس احمق لڑکے کے ہاتھ میں تھا کر گدھے پر بیٹھ کر ساس کے گھر جانے کی اجازت دے دی اتنی تکلیف بھی نہیں کی کہ بچی کے سسرال تک چلا جاتا کہ یہ احمق داماد راستے میں گھر پہنچنے سے پہلے میری بیٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔

(۷) لڑکے کی ماں نہایت سخت تھی مگر جبکہ کو ماں کی اجازت کے بغیر شادی کرتے ہوئے نہ شرم آئی نہ کوئی فکر ہوئی۔ وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بیوی کو ماں کی اجازت کے بغیر اس کے گھر لے گیا۔

(۸) اس کی ماں اس قدر لالچی تھی کہ اس نے جب دیکھا کہ جبکہ ایک خوبصورت لڑکی لے آیا ہے تو اس سے پوچھنے کی زحمت تک گوارا نہ کی کہ احمق یہ لڑکی کون ہے کہاں سے لایا ہے، کیوں لایا ہے اور کس کی اجازت سے۔ تو اتنا احمق ہے کہ کچھ کماتا نہیں ہے تجھے تو میں گھر سے نکال رہی تھی اب تو میری غربت میں ایک لڑکی بھی لے آیا ہے یہ مفلسی میں گایا آٹا والا معاملہ ہے لیکن ماں نے سوچ لیا کہ لڑکی امیر گھر کی ہے اپنے شوہر کا خیال رکھے گی اور میرا بھی خیال رکھے گی۔ اس لڑکی پر میرا احسان ہے کہ میں اگر اس بیٹے جبکہ کو نہ جانتی تو یہ اداسی میں گھٹ کر مر جاتی۔ میرے بیٹے کی بے وقوفی اس بدقسمت لڑکی کے لیے خوشیوں کا پیغام لائی ہے۔ میرا بیٹا تو خوش قسمت ہے۔

(۹) کہانی میں بچوں کو جو پیغام دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ زندگی کا مقصد کماتا اور کھانا ہے۔ جو کماتے

کے قابل نہیں وہ عزت کے قابل نہیں اس کی بے عزتی کرنا جائز ہے بلکہ اسے گھر سے نکال دینا چاہیے۔ کسی احمق بے وقوف بچے کو گھر میں رکھ کر کھلانا پلانا احمقانہ بات ہے جو اپنا بوجھ خود نہیں اٹھا سکتا اس کا بوجھ ماں باپ گھر والوں کو بھی نہیں اٹھانا چاہیے۔ جدید مغرب کا یہ تصور جو انسان نے اختیار کیا ہے جانور بھی اس سے بہتر تصور رکھتے ہیں مثلاً افریقہ کے جنگلوں میں ہاتھیوں کے غول کی رفتار کا تعین غول کا سب سے کم زور ہاتھی کرتا ہے۔ اس کی رفتار کے مطابق تمام ہاتھی اپنی رفتار کم کر لیتے ہیں اجتماعیت کی خاطر ایک کم زور ہاتھی کے لیے پورا غول قربانی دیتا ہے۔ چیتے کی مادہ بچے دیتی ہے تو چیتا اپنے بھٹ میں نہیں جاتا وہ باہر بیٹھ کر اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔ اندر صرف ماں اور بچے ہوتے ہیں وہ ماں کے لیے شکار تلاش کر کے لاتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ وہ ایک دن اس مشقت محنت سے تنگ آ کر چپکے سے غائب ہو جائے۔ وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے اپنی بیوی کی جدائی برداشت کرتا ہے اپنے خاندان کو تنہا چھوڑنا اس کی فطرت کے خلاف ہے مگر اس کہانی میں ماں جیسی ہستی کو اس قدر کمتر درجے پر دکھایا گیا ہے جب کہ ماں کی محبت دنیا کی ایسی محبت ہے کہ رسالت مآبؐ نے جب بندوں سے اللہ کی محبت کی گہرائی کو بیان کیا تو اللہ کی محبت کو ماں کی محبت کے ذریعے بیان کیا فرمایا کہ اللہ بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت رکھتا ہے۔ ایک اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ پیارا اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچے کے لیے **لَلّٰہُ اَرْحَمُ لِعِبَادِہِ مِنْ ہٰذِہِ بَوْلِہَا** (صحیح بخاری و مسلم) اور ایک انسان کی ماں کی محبت کیا ہوتی ہے؟ اسے محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جانور کی ماں تک اپنی اولاد سے ایسی محبت کرتی ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہمارے گھر میں ایک مرغی تھی اچانک بیمار ہوئی دہلی ہونے لگی طبیعت اس کی بگڑتی چلی گئی اس نے انڈے دینے شروع کیے وہ ہم نے کھائے آخری انڈہ دیتے ہوئے وہ بطخ کے گھر کی طرف چلی گھسٹتی لڑکھڑاتی ہوئی وہاں پہنچی آخری انڈہ اس نے بطخ کی دہلیز پر دے کر اپنے انڈے کو بطخ کے سپرد کر دیا اور یہ فرض ادا کرنے کے بعد وہیں اپنی جان دے دی۔ بطخ اسے اپنا انڈہ سمجھ کر گھر میں لے گئی پھر بطخ بھی کئی انڈے دے رہی تھی۔ بچے پیدا ہوئے ان میں مرغی کا بچہ بھی شامل تھا بطخ بچوں کو تیرنے کے لیے پانی میں لے جاتی تو مرغی کا بچہ تیرنے کے بجائے بطخ کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا بطخ اسے اپنا ہی بگڑا ہوا بچہ سمجھتی جو پانی سے خوف کھاتا ہے ایک مرغی موت کا اندازہ کرتے ہی اپنے مستقبل کو ایک محفوظ ہاتھ میں منتقل کرنا چاہتی ہے یہ ماں کی محبت ہے مغرب اور

Edexcle ہمیں کس قسم کی ماں سے آگاہ کر رہا ہے؟

لبرل ازم اور سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی اصولوں کا سنہرا اصول ہے کہ Each according to his ability کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق رزق ملنا چاہیے۔ جبکہ سوشلزم اس اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق ملنا چاہیے کہ تمام انسان برابر تو ہیں مگر صلاحیتوں میں برابر نہیں ہیں۔ Each according to his need لہذا اجتماعیت کو کم زور افراد کے لیے قربانی دینا چاہیے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوق اور اس کے خاندان بنی آدم یعنی انسان کی خدمت ہر مسلمان کا فرض ہے کیونکہ تمام انسان اللہ کا کنبہ ہیں الخلق عیال اللہ جو جس کے جتنا قریب ہے اس کی کفالت اس کی اخلاقی مذہبی شرعی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی کمانے کے قابل نہیں ہے تو کمانے والوں کی انفرادی، اجتماعی، گروہی، معاشرتی، خاندانی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عزیز کا اور اپنی کا بھی خیال رکھیں اللہ تعالیٰ تو قیامت کے دن بندے سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ جواب میں انسان کہے گا اے اللہ آپ کیسے بھوکے پیاسے ہو سکتے ہیں؟ تو جواب ملے گا میرا فلاں بندہ بھوکا تھا فلاں پیاسا تھا تم نے اس کا خیال نہیں رکھا۔ اسلام اس نقطہ نظر کا حامی ہے حدیث میں ماں کی محبت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی محبت ستر ماؤں کی محبت سے زیادہ ہے یعنی اللہ کی محبت کے لیے مثال دی گئی تو اس دنیا سے ماں کو منتخب کیا گیا یہ کہانی ماں کی ایک نہایت گھناؤنی تصویر پیش کرتی ہے جو روایتی، مذہبی، الہامی اور اسلامی تہذیبوں کے تصور انسان، تصور عبد اور تصور ماں کے صریحاً منافی ہے یہ خالصتاً مغربی مادہ پرست ماں ہے جو پیسے کے لیے جیتی اور پیسے کے لیے مرتی ہے اس کی زندگی کا مقصد محض مادی خوش حالی اور ترقی ہے۔ چونکہ احق بیٹے نے اپنی حماقت سے ہی مادی خوش حالی کے دروازے اپنے اوپر کھول لیے تھے لہذا وہ خوش ہو گئی۔ مزے کی بات یہ کہ جدیدیت (modernism) کے فلسفے اور فکر کے تحت تخلیق کردہ اس کہانی کی کتاب پر روایتی مختصر کہانیاں [Traditional Short Stories] لکھا گیا ہے یہ محض دھوکہ ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ ماضی بھی ایسا تھا اور عہد حاضر میں ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے۔ (جاری ہے)

دینی مدارس کب توجہ فرمائیں گے؟

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ بہت سے اسلامی اور عرب ممالک میں مسجد و مدرسہ حکومت کے کنٹرول میں ہے اور پرائیویٹ سیکلر یا بالفاظ دیگر علماء کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حال ہی میں مصر میں الاخوان المسلمون اور دوسری دینی جماعتوں نے جس طرح انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور حکومت بنا لی اس کے بعد دین مخالف بین الاقوامی قوتوں اور ان کی مرضی اور ایجنڈے کے مطابق حرکت میں آنے والے فوجیوں، سیاستدانوں اور دوسرے عناصر نے مستقل بنیادوں پر دینی عناصر اور اداروں کو کچلنے کا جو پروگرام بنایا ہے اس میں مساجد اور مدارس کو حکومتی تحویل میں لینا بھی شامل ہے اور اس پر عمل درآمد شروع بھی ہو گیا ہے۔

پاکستان میں بھی دینی مدارس کفار اور ان کے مقامی حمایتیوں کی نظر میں مسلسل کھٹک رہے ہیں اور اس کے لیے ترغیب و ترہیب دونوں طرح کے ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں۔ حکومتوں کو مدارس کی اصلاح کے نام پر ڈالر بھی دیے جا رہے ہیں اور دباؤ کا حربہ بھی جاری ہے۔ اس بیرونی اور حکومتی دباؤ کا مقابلہ کرنے کی نفسیات نے دینی مدارس کا ایک ایسا دفاعی مائنڈ سیٹ بنادیا ہے جو خود احتسابی، اصلاح اور ترقی کے لیے درکار تخلیق و تحقیق اور جدت و تنوع کے رجحانات کو بھی پس پشت ڈال رہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ دینی مدارس متوقع خدشات سے ڈر کر اپنا طریق کار بدل لیں لیکن ہم مدارس کے ہمدرد اور ہی خواہ ہونے کی وجہ سے ان سے درخواست کرتے ہیں کہ:

- دینی مدارس اپنے ہاں احتساب اور اصلاح و ترقی کے لیے خود فعال ادارے بنائیں اور بیرونی محرکات سے قطع نظر، اپنی مرضی اور ارادے سے منظم غور و فکر کے اور اصلاح و ترقی کے لیے اقدامات خود تجویز کریں اور ان پر عمل درآمد بھی خود کریں۔

- کوئی برا اور سخت وقت آنے سے پہلے اس کی پیش بندی اور حفاظتی اقدامات کرنا بزدلی نہیں، عقل و حکمت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

اگر پانچوں دینی وفاق مدارس کی اصلاح و ترقی کے لیے دودو آدمی نامزد کریں تو دس فاضل ارکان

پر مشتمل ایک ایسی کمیٹی یا کمیشن تشکیل دیا جاسکتا ہے جو اس غرض کے لیے تجاویز تیار کرے اور پانچوں وفاقتوں کے صدور و سیکرٹری حضرات پر مشتمل ”اتحاد مدارس دینیہ“ سے اس کی منظوری حاصل کر کے اس پر عمل درآمد کرائے۔

ابتداءً ہم مجوزہ کمیٹی کے غور و فکر کے لیے دو نکاتی ایجنڈا دینی مدارس کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

ایک: یہ کہ دینی مدارس کی تعلیم اور نصاب و نظام سے فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

دوسرے: مدارس کے فضلاء کی خدمات کو صرف مدارس و مساجد تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ معاشرے اور ریاست کو ان کی خدمات سے استفادے کا موقع بھی دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نصاب کو کچھ وسعت دی جائے اور مدارس کی اسناد کو حکومت کے متعلقہ اداروں سے منظور کرایا جائے۔

ہم ان دونوں نکات کے لیے تفصیلی تجاویز اور لائحہ عمل بھی تجویز کر سکتے ہیں اور دینی مدارس کی اصلاح و ترقی کے لیے مزید نکات بھی پیش کر سکتے ہیں لیکن ہم عداً ان امور کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے اور اہل مدارس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری درخواست پر غور فرمائیں اور اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ دوسروں کی مداخلت سے پہلے خود مدارس کی اصلاح و ترقی کے لیے سوچیں اور ضروری فیصلے کریں اور اس طرح سیلاب آنے سے پہلے اپنے حفاظتی پشتے مضبوط کرنے کے لیے اقدامات کریں۔

ہم نے یہ تجاویز اس لیے دی ہیں کہ ہم دینی مدارس اور علماء کرام سے محبت کرتے ہیں، ان کے خیر خواہ ہیں اور ان کے کام کو مزید بہتر اور موثر دیکھنے کے متمنی ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

مولانا وحید الدین خاں کی فکر کا تجزیہ

مولانا وحید الدین خاں کی فکر پر سید خالد جامعی صاحب کا علمی محاکمہ والا مضمون چونکہ طویل تھا اس لیے البرہان صرف اس کی تین ابتدائی قسطیں (شمارہ نومبر و دسمبر ۲۰۱۳ء و جنوری ۲۰۱۴ء) شائع کر سکا۔ مکمل مضمون کے لیے سید خالد جامعی صاحب سے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

فرقہ واریت کی وجوہات اور ان کا حل

پاکستان اس وقت فرقہ واریت کا گڑھ بن چکا ہے۔ تقریباً ہر مسجد ایک علیحدہ فرقے کی علم بردار ہے اور مسجدوں کی تعداد ہزاروں نہیں لاکھوں میں ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے چار اینٹیں رکھ کر ایک الگ مسجد کھڑی کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح ایک نیا فرقہ جنم لے لیتا ہے اگرچہ ظاہری بورڈ دیوبندی، بریلوی، شیعہ سنی یا اہل حدیث کا لگا ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر سال دینی مدارس سے ہزاروں طلبہ آخری سند لے کر فارغ التحصیل ہو رہے ہیں۔ تعلیم مکمل کر کے زندگی کا پہلا مسئلہ روزگار کا ہوتا ہے اور ہمارے ان نوجوانوں کو سوائے مسجد کی امامت، خطابت اور فرقہ واریت کی بنیاد پر اپنا ایک جتھہ بنانے کے اور کوئی کام آتا نہیں ہے لہذا خود روزگاری (Self Employment Mode) کا طریقہ کام میں لاتے ہوئے وہ کوئی بستی تلاش کرتے ہیں جہاں یا تو قرب و جوار میں کوئی مسجد نہ ہو اور اگر ہو تو اُن کے نظریات کے برعکس کسی اور فرقے کی ہو تو وہ اپنا ڈول ڈال دیتے ہیں۔ بس اس کام کے لیے چند پر جوش ساتھی، ایک لاؤڈ سپیکر اور ادھر ادھر کوئی خالی قطعہ زمین درکار ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کا کام آسانی سے چل پڑتا ہے کیونکہ کافی لوگ مسجد کی تعمیر میں چندہ دے کر اپنا گھر جنت میں بنوانا چاہتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ اُن کے اس نیک جذبے سے شاید انتشار فی الامت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اگر یہ پہلو دیکھیں تو فرقہ واریت بنیادی طور پر پیٹ کا مسئلہ ہے۔ یہ بات ہم نے عوامی سطح (گر اس روٹ لیول) کے حالات دیکھ کر کی ہے ذرا اونچی اور شاید دینی مدارس کی سطح پر بھی فرقہ واریت بنیادی طور پر معاشی ضروریات اور معاشی تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے جاری ہے۔

اگر ہم دینی حلقوں کی بلند ترین سطح پر نظر کریں تو فرقہ بندی اور مذہبی بنیادوں پر گروہ بندی کی بنیادی وجہ سیاست ہے۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مکتب فکر کے متعدد سیاسی گروہ اور سیاسی پارٹیاں ہمارے اس نقطہ نگاہ کا بین ثبوت ہیں۔ جماعت اسلامی جیسی غیر فرقہ واریت پر مبنی مذہبی جماعت کو بھی لوگوں نے فرقہ سمجھنا شروع کر دیا ہے یا شاید اہل جماعت کے بعض اپنے اقدامات کی وجہ سے ایسا ہوا ہے مثلاً کسی گلی محلے میں پہلے ایک مسجد موجود تھی اور جماعت کے بعض پُر جوش لیکن حکمت سے عاری کارکنوں نے اپنی ایک مسجد کھڑی کر دی اور اس کے چہرے پر جماعت اسلامی لکھ بھی دیا تو فرقہ واریت کا تاثر تو ابھرے گا۔ ہماری ان معروضات کا مقصد یہ ہے کہ فرقہ واریت کی ایک مضبوط وجہ سیاسی بھی ہے۔

فرقہ واریت کی ایک وجہ نمایاں ہونے کا جذبہ، مختلف نظر آنے کا شوق اور سماج میں اہمیت حاصل کرنے کی بیماری بھی ہے جو ہمارے بہت سارے "علماء کرام" کو لگی ہوئی ہے۔ آپ کو کئی علامہ صاحبان نظر آئیں گے جو تنہا پرواز کے شوقین ہیں۔ سیاست اُن کا پیشہ نہیں ہے، معاش اُن کا مسئلہ نہیں ہے لیکن دانشوری بکھارنا ان کی مجبوری ہے۔ اب یہ دانشوری تب یکے گی جب یہ دوسروں کی دانشوری سے مختلف نظر آئے گی لہذا اکتانہ آفرینی، منطقی موثکافیاں اور لفاظی کا سہارا لیں گے۔ ہماری مراد اس سے یہ ہے کہ فرقہ واریت ایک سماجی مرض بھی ہے۔

ہم نے فرقہ واریت کے مسئلہ پر بہت غور کیا کہ فرقہ واریت کی کوئی اسلامی اور دینی بنیاد بھی مل جائے لیکن ناکامی ہوئی۔ ہاں مختلف مسائل پر اختلاف رائے تو اہل علم میں ہو سکتا ہے۔ خود صحابہ کرام میں بھی مختلف اشوز پر اختلاف رائے تاریخ کا حصہ ہے لیکن اس سے فرقے جنم لیں یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ دین کی اساسیات میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا اور نہ ہی معقول سوچ کے لوگوں میں ہو سکتا ہے۔

تاریخی طور پر ہندو پاکستان کے دینی مدارس فرقہ واریت کے علمبردار رہے ہیں اور ہیں۔ ان مدارس کے مختلف الرائے ہونے کی کوئی علمی وجہ بھی ہو سکتی ہے لیکن ان کے توسط سے مسلم اُمہ کو تقسیم کرنے کا عمل بھی بنیادی طور پر معاشی، سیاسی اور سماجی ہے۔ ان مدارس کے ارباب حل و عقد شاید (خاکم بدہن) اللہ کے خوف سے اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے اس قدر عاری ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں کو تقسیم کر کے کمزور کرنے اور فرقہ واریت سے تنگ آئے ہوئے نوجوانوں کا دین اسلام سے برگشتہ ہونے کا انہیں کوئی احساس نہیں ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ لوگ جمعہ کے روز مساجد میں اس وقت آتے ہیں جب مولوی صاحب کی تقریر ختم ہونے کے قریب اور خطبے کی اذان ہونے والی ہو۔ لوگ ان فرقہ باز مولویوں کے قصے کہانیاں نہیں سننا چاہتے، ہاں جو علماء کرام قرآن و حدیث پر مبنی علم و حکمت سے لبریز ٹھوس بیان فرماتے ہیں، ان کی مساجد میں لوگ پہلی اذان پر ہی کھینچے چلے آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہفتہ وار خطبہ جمعہ کی شکل میں مسلمانوں کی مسلسل تعلیم کا جواہتمام کیا ہے وہ یہ فرقہ باز مولوی ناکام بنا رہے ہیں۔ ذرا تصور کریں کہ ایک مسلمان سال بھر میں دین کی تعلیمات سے بھر پور باون (۵۲) خطبات سُنے تو اس کی دینی معلومات اور دینی شعور کا لیول کیا ہو جائے گا:

پس چہ باید کرد

فرقہ واریت کا رونا تو سب روتے ہیں اور ہم نے بھی اپنی اس مختصر تحریر میں کافی آہ و بکا کر لی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کا حل کیا ہے:

ہماری رائے میں اس کا حل اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی اسلامی شقوں کو پوری قوت اور پورے اخلاص کے ساتھ نافذ کرنے میں ہے۔ قرارداد مقاصد اور دستور کی شق نمبر 31 کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہم درج ذیل تجاویز دیتے ہیں۔

۱۔ اسلامی نظریاتی کونسل وفاقی وزارت مذہبی امور اور صوبائی وزارت ہائے مذہبی امور کو ملک بھر کی مساجد کو ریگولیٹ کرنے کا ایک تفصیلی لائحہ عمل بنا کر دے جسے پارلیمنٹ منظور کر کے قانون کی شکل دے۔

۲۔ ضلعی سطح پر مذہبی امور کا محکمہ قائم کیا جائے جو اسلامی نظریاتی کونسل کے دیے گئے لائحہ عمل اور پارلیمنٹ سے پاس شدہ قانون کی روشنی میں مساجد کا انتظام و انصرام کرے۔

۳۔ معاشرے سے مدد لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن مساجد کے انتظام و انصرام کے جمع مصارف حکومت مہیا کرے۔

۴۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں آئمہ مساجد کی کم از کم مذہبی تعلیمی قابلیت طے کی جائے۔ آئمہ مساجد کی تقرری ضلعی سطح پر قائم علماء کا بورڈ کرے۔ علماء کی تنخواہ اور دیگر مراعات ضلعی حکومت کی ذمہ داری ہو۔ آئمہ مساجد کے عزل و نصب کا اختیار علماء کے ضلعی بورڈ کے پاس ہو۔

۵۔ علماء کے ضلعی بورڈ میں علم اور تقویٰ کی بنیاد پر جید علماء شامل ہوں۔ ان کا انتخاب فرقہ واریت پر مبنی نہ ہو۔ علماء کے ضلعی بورڈ میں شامل علماء کا انتخاب دیے گئے معیار کے مطابق ضلعی محکمہ مذہبی امور کرے گا جس کی حتمی منظوری اسلامی نظریاتی کونسل دے گی۔

۶۔ صوبائی سطح پر بھی جید علماء کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو صوبے میں صوبائی وزارت مذہبی امور کی راہنمائی کرے گا۔ علماء کے صوبائی بورڈ کا انتخاب اور تشکیل اسلامی نظریاتی کونسل کرے گی۔

۷۔ علماء کا صوبائی بورڈ صوبے میں قائم دینی مدارس کو بھی ریگولیٹ کرے گا۔

۸۔ اسلامی نظریاتی کونسل قرآن و سنت پر مبنی دینی مدارس کے چھ سالہ کورس کا نصاب تشکیل دے گی جو سب دینی مدارس میں پڑھانا لازمی ہوگا۔ اس کے بعد تخصص کے آخری دو سالوں میں مختلف مسالک کے مدارس اپنے اپنے مسلک کی خصوصی تعلیم دے سکتے ہیں جس میں دوسرے مسالک سے نفرت

اور کدورت کی باتیں شامل نہ ہوں۔ نصاب کے حوالے سے صرف شیعہ اور سنی دو مسلک تسلیم شدہ ہوں گے۔

۹۔ علماء کرام کا صوبائی بورڈ خطبہ ہائے جمعہ کے موضوعات اور مواد طے کرے گا جس کے ذریعے عوام الناس میں دینی تعلیمات کا فروغ اور دینی معاملات کا شعور پیدا کیا جاسکے۔ شیعہ سنی مسالک کی مساجد میں خطبہ ہائے جمعہ کے موضوعات تو مشترک ہوں گے تاہم نفس مضمون یعنی مواد میں مسالک کا خیال رکھا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ مسالک اور فرقوں پر مبنی سیاسی جماعتوں پر قانوناً پابندی لگائی جائے۔

۱۱۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تمام قانونی سفارشات کو پارلیمنٹ میں پیش کر کے جلد از جلد قانون سازی کی جائے تاکہ یہ تاثر ختم ہو کہ حکومت قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی نہیں کرنا چاہتی۔

۱۲۔ انتظامی میسنجری کو کرپشن اور نااہلی سے پاک کیا جائے۔ عدالتی نظام جو اس وقت اینگلو سکسن (Anglo Saxon) قانون پر چل رہا ہے اسے اسلامی نظام انصاف کے مطابق ڈھالا جائے اور عوام الناس کو فوری انصاف مہیا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ملک میں امن اسی سے قائم ہوگا۔

۱۳۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی مجوزہ ذمہ داریوں کے پیش نظر اس کے شاف، بجٹ اور تنخواہوں و سہولتوں میں اضافہ کیا جائے۔

۱۴۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین کی تعلیم، تصانیف اور تقویٰ کا ایک معیار مقرر کیا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان اور چیئرمین کا انتخاب اور تقرر سپریم جوڈیشل کونسل کے دائرہ اختیار میں لایا جائے اور انہیں ہٹانے کا بھی وہی طریقہ اپنایا جائے جو سپریم کورٹ کے جج صاحبان کے لیے مقرر ہے۔

۱۵۔ حکومت اسلامی نظریاتی کونسل کی نگرانی میں اسلامی تحقیقی کتب کی اشاعت کا ایک اعلیٰ ادارہ قائم کرے نیز شیخ زید اسلامک سنٹر کو جو کراچی یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی میں قائم ہیں، اعلیٰ تحقیقی اداروں کی شکل میں دوبارہ منظم کرے اور ان سنٹرز کو خصوصی فنڈز مہیا کرے جو قرآن و سنت کی روشنی میں سوشل سائنسز کے میدان میں تحقیقی اجتہادی کام کریں۔

الیں منکم رجل رشید؟

راجہ ظفر الحق، عرفان صدیقی اور احسن اقبال توجہ فرمائیں

حال ہی میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی ہے کہ میڈیا کو اسلامی اور پاکستانی اقدار کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس سے پیشتر یہ معاملہ سپریم کورٹ میں بھی گیا تھا کہ میڈیا کو عریانی و فحاشی سے روکا جائے لیکن کچھ نہ بنا۔ ہم جیسے بہت سے لوگ مسلسل احتجاج کر رہے ہیں کہ پاکستانی میڈیا خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کو اسلامی اصول و اقدار اور نظریہ پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی سے روکنے کے لیے اقدامات کیے جائیں کیونکہ دنیا کا کوئی ملک اور معاشرہ آزادی اظہار کے نام پر معاشرے کے اساسی اور متفق علیہ اصولوں کی دھجیاں بکھیرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ امریکہ میں بہت آزادی ہے لیکن کسی کو جمہوریت، آئین اور فیڈریشن کے خلاف بولنے کی اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن پاکستانی میڈیا کا باوا آدم نرالا ہے کہ یہاں ریاست اور اس کے اساسی نظریے کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور اسے کوئی چپک کرنے والا نہیں۔

ہم یہ تلخ بات کہنا نہیں چاہتے کہ کیا میڈیا مالکان اور پالیسی سازوں کے گھروں میں بہو بیٹیاں نہیں؟ یا کیا شرم و حیا اسلام کی اقدار نہیں رہیں؟ ہم یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ میڈیا یہ سب کچھ غیر اسلامی اور غیر پاکستانی قوتوں کی مہمیز پہ کر رہا ہے۔ ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ پوری حکومت بیچاری بہت مصروف ہے۔ اتنے اہم قومی کام ہیں کہ میڈیا کے خلاف شکایت سننے جیسے معمولی کام کے لیے کسی کے پاس وقت ہی نہیں۔ مرکزی وزیر اطلاعات پرویز رشید صاحب کا تو غالباً یہ ایٹو ہی نہیں اور یوں لگتا ہے کہ وہ پرویز زیادہ ہیں اور رشید کم۔ ہمیں اس حکومت میں کچھ شریف آدمیوں کے نام یاد آتے ہیں جو اسلامی پس منظر رکھتے ہیں اور جن کو کچھ اسلامی اقدار کا پاس ہو سکتا ہے۔ ہم جناب راجہ ظفر الحق، احسن اقبال اور عرفان صدیقی صاحب کو متوجہ کرتے ہیں کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو کسی وقت وزیراعظم صاحب کو اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائیں تاکہ اس ابلیسیٹ کو روکنے کے لیے عملاً کچھ تو ہو، خالی بیان بازی اور ہدایت جاری کرنا یا قرارداد پاس کرنا مسئلے کا حل نہیں۔

تنظیم اسلامی کا منہج اور چند مغالطے (آخری قسط)

تیسرا اعتراض:

جناب محمد رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”تنظیم کے ابتدائی تشخیصی اور بنیادی موقف اور اعلانیہ پروگرام سے متضاد ایک اعلان ہے جسے تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے پیہم اصرار اور تکرار سے بیان کیا جاتا ہے۔ سید مودودی مرحوم و مغفور نے احیائے اسلام کے لیے جس ”عمومی تحریک اصلاح“ کا ذکر کیا ہے وہ نام نہاد ”انقلابی جدوجہد“ کا ابتدائی مرحلہ ہے جبکہ اس مجہول الاسم ”انقلابی جدوجہد“ کا تکمیلی مرحلہ وہ ہے جسے جناب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے منہج نبوی ﷺ اور سیرت نبوی ﷺ کے اہم مرحلہ ”قال فی سبیل اللہ“ میں اجتہاد کرتے ہوئے پُر امن احتجاجی تحریک کو ”غیر مسلح تصادم“ کے عنوان سے شد و مد اور نہایت تکرار و اصرار سے قبول کرانے کی دعوت دی۔“

جواب:

امیر تنظیم اسلامی نے مولانا کی تحریک کو انقلابی کہا ہے جیسا کہ مولانا مودودیؒ کے الفاظ سے یہ بار بار ظاہر ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی محض فرد کی اصلاح کے لیے قائم نہیں ہوئی تھی بلکہ باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر دین حق کا غلبہ و قیام اول دن سے اس کا مشن تھا۔ نظام کی اس تبدیلی کے لیے قرآن کی اصطلاح اقامت دین اور ”اظہار دین الحق علی الدین کلمہ“ ہے۔ جب کہ آج کی اصطلاح میں اس تبدیلی کو انقلاب کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ مشن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہی انقلابی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا اپنے کام کے ابتدائی مراحل کے لیے بھی جا بجا ’انقلاب‘ کے لفظ کو استعمال کیا جس سے ان کے کام کا رخ بجا طور پر واضح ہوتا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ تنظیم اسلامی احتجاجی سیاست کے لیے مولانا مودودی سے دلیل نہ پکڑتی ہے نہ ان پر احتجاجی طریقہ ترک کرنے کا الزام دھرتی ہے۔ تنظیم اسلامی نے احتجاجی تحریک کا طریقہ خود ایجاد کیا ہے۔ تنظیم کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ منہج انقلاب نبوی ﷺ کے آخری مرحلے مسلح تصادم کا متبادل ہے۔ آپ احتجاجی سیاست حتیٰ کہ ہمارے پیش کردہ منہج انقلاب نبوی ﷺ سے بھی اختلاف رکھ سکتے ہیں کہ یہ طریقہ منصوص نہیں ماخوذ ہے یعنی یہ طریقہ قرآن و سنت کی نصوص میں حرف بحرف اس طرح

لکھا نہیں ہے جیسے ہم بیان کرتے ہیں بلکہ ہم نے قرآن و سنت کی نصوص، سیرت نبویؐ و صحابہؓ اور مزاج اسلامی سے اخذ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ استنباط و استشہاد میں غلطی کا امکان بہر حال موجود رہتا ہے اور اس غلطی پر تنقید کرنا اہل علم کا حق ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم یہ تنقید ٹھنڈے دل سے سنیں، سمجھیں اور اگر محسوس ہو کہ واقعاً ہم سے کسی قسم کی غلطی ہوئی ہو تو اس کی اصلاح کریں۔ بصورت دیگر ہم اس تنقید پر اپنی وضاحت پیش کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جناب عاکف سعید صاحب نے اپنے خطاب زیر بحث میں فرمایا:

”ابتدائی طریقہ کار تو انہوں نے بڑی عمدگی سے بیان کیا لیکن آخری مراحل کو پورے طور پر واضح نہ

کیا۔ اب یہ مصلحتاً بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کا ذہن پوری طرح واضح نہ ہو“

امیر تنظیم، مولانا کے اس طریقے کے بارے میں کہتے ہیں کہ آخری مرحلہ ان کے ہاں واضح نہیں ہے تو یہ مولانا کے الفاظ ہی سے ظاہر ہے۔ مولانا خود اپنی تحریروں میں بار بار لکھتے ہیں کہ ایک لازمی اور طبعی نتیجے کے طور پر وہی نظام قائم ہو جائے گا جس کے لیے زمین تیار کی گئی ہوگی۔ نیا نظام حکومت تشکیل دینے کے لیے ضروری ہے کہ ”اصلاح پسند“ حکومت میں آئیں یا مولانا کے الفاظ میں انقلاب قیادت واقع ہو اس کے بغیر نظام کیسے قائم ہوگا۔ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی دعوت کے نتیجے میں عوام الناس اپنی اسلامی نظام کی پیاس کو کیسے ظاہر کریں گے اور پہلے سے قائم شدہ نظام کے محافظ کیسے اندازہ کریں گے کہ ان کا نظام چلنا مشکل ہو گیا ہے یا انقلابی لوگ ان حاکموں کو یہ حقیقت کس طریقے سے باور کرائیں گے۔ اور یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکمران اس راز کو پا ہی جائیں تو کیا اتنے حقیقت شناس واقع ہوں گے کہ کرسی چھوڑ کر صالح قیادت کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دے دیں؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں نہ پا کر ہم کہتے ہیں کہ آخری مرحلے کے خدوخال انہوں نے واضح نہ فرمائے تھے۔ لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ طبعی نتیجے کے طور پر سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔ اسلامی انقلاب کے طریقے سے بحث کرنے والا آپ کا ایک اہم مضمون ”تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں“ ہے۔ یہ دراصل اپریل ۱۹۴۵ء میں جماعت کے سالانہ اجتماع سے آپ کا خطاب ہے، اس میں مولانا فرماتے ہیں:

”اسی طرح نظام امامت کا وہ انقلاب بھی جو آپ کی پیش نظر ہے کبھی محض دعاؤں اور تمناؤں سے رونما نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس قانون کو سمجھیں اور اس کی ساری شرطیں پوری کریں جن کے تحت دنیا میں امامت قائم ہوتی ہے۔“ (روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۱۶، زیر عنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

”میز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک (صالح) گروہ کے محض وجود میں آ جانے ہی سے نظام

امامت میں تغیر واقع نہ ہو جائے گا کہ ادھر وہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فساد و فجار کو اقتدار کی گدی سے ہٹا کر انہیں مسند نشین کر دیں۔ (روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۲۷، زیر عنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

”تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں“ سے بظاہر یہ شک پڑتا ہے کہ بس اس میں اخلاق عالیہ کی تلقین کے ساتھ خوشخبری ہوگی کہ بس حکومت کا ہما آپ کے سر پر منڈلا ہی رہا ہے لیکن مولانا اخلاقیات کی عمدہ تعلیم و توجیہ کے ساتھ دوسرا رخ بھی دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

”مجموعی طور پر انسان کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز نہ تو مادی قوت ہی سے ہو سکتا ہے اور نہ ہی اخلاقی قوت سے، اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں یا وہ ان میں دوسروں کی نسبت کمزور ہوتا ہے اگرچہ اصلی فیصلہ کن اہمیت پھر بھی اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی طاقت کی۔“ (روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۱۸، زیر عنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

آگے مولانا رقم فرماتے ہیں:

”لیکن اگر کوئی ایسا منظم گروہ موجود ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دنیا پر فضیلت رکھتا ہو اور وہ مادی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی کوتاہی نہ کرے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت و قیادت پر قائم رہ سکے۔“

یہاں تک یہ واضح ہو چکا ہے کہ مولانا کے ہاں بھی انقلاب قیادت، ایک طبعی نتیجہ پر ہی نہ ہوگا بلکہ اس کے لیے اخلاقی طاقت کے ساتھ ساتھ، مادی طاقت سے کام بھی لینا پڑے گا اور یہ غلبہ معجزانہ انداز سے بھی نہ ہوگا بلکہ عادی قوانین ہی کے تحت ہوگا۔ اب سوال یہ ہے عادی قوانین کے تحت، مادی قوت کے استعمال کا طریقہ کیا ہو اور اس کے مراحل و لوازم کیا ہوں گے؟ ہمارے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ مولانا جیسے مدبر اور پیش بند شخص نے یا ان کے ساتھیوں نے اس مسئلے پر کبھی سوچا نہ ہو۔ نہ صرف وہاں یہ کہ سوچا جاتا تھا بلکہ پوچھا بھی جاتا تھا۔ ایسے سالکین کا ذکر مولانا اپنے الفاظ میں یوں کرتے ہیں:

”اس دور میں سب سے زیادہ جو سوال سوچنے سمجھنے والے طبقے کو پریشان کرتا تھا وہ یہ تھا کہ ----- عملاً وہ انقلاب کیسے قائم ہوگا جو ہم برپا کرنا چاہتے ہیں؟ فرض کیجئے ہم غالب حصہ آبادی کے خیالات، ذہنیتیں، اخلاقی معیارات، سب کچھ بدل دیتے ہیں تب بھی کفر کا اقتدار خود بخود ختم نہ ہوگا اسے بدلنے کے لیے بہر حال کوئی عملی صورت ہی اختیار کرنا

ہوگی۔۔۔۔۔ یہ سوالات اس زمانے میں بار بار میرے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔“ (تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، ۱۰۵)

تقسیم ہند سے پہلے اس مسئلے کی طرف مولانا مختلف بلکہ مختصر انداز سے روشنی ڈالتے رہے ہم ان چیزوں کو ایک ترتیب سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

فرماتے ہیں:

”بلکہ اس جماعت کو کفر و فسق کی طاقتوں سے زندگی کے ہر میدان میں، ہر ہر قدم پر کھٹکنا اور مجاہدہ کرنا ہوگا اور اقامتِ حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبتِ حق اور اپنی اہلیت کا ثبوت دینا پڑے گا۔ یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاء تک مستثنیٰ نہ رکھے گئے، کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنیٰ رہے گا۔“

(روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۲۷، زیر عنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

”تمام اہل خیر وصلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں اجتماعی قوت پیدا کریں اور سردھڑکی بازی لگا کر ایک ایسا نظام حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی کا منصب مومنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔“ (روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۱۳، زیر عنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

”اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو اصلاح سے، اضطراب کو امن سے، بد اخلاقیوں کو اخلاق صالحہ سے، اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اس لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوع انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جاسکے اور امامت کے نظام میں تعمیر کیا جاسکے۔“

(روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۰۰۸، ۲۰۰۹ زیر عنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

”ہمیں ایک عوامی تحریک چلانے سے پہلے ایسے آدمی تیار کرنے کی فکر ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیش نظر کام کا جو نقشہ وہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کردار کی کثیر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے۔ تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔“

ایک ٹھوس، پائدار، اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔“ (جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ، اور لائحہ عمل صفحہ ۴۳، ۴۴)

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے ایک تحریک بہر حال مولانا کے ذہن میں موجود تھی۔ اب اس تحریک کے مراحل کیا ہوں گے، اس کا بھی ایک خاکہ لازماً، مولانا اور قیادت کے ذہنوں میں بہر حال موجود تھا، ملاحظہ فرمائیں:

”اس دوران منفرد اشخاص کو بھی اور پورے گروہ کو بھی بہت سے مراحل سے گزرنا پڑے گا اور کئی رکاوٹیں پیش آئیں گی جن سے ہر مرحلے کے حالات کے مطابق نمٹنا ہوگا۔ ان کی تفصیل نہ اس وقت بتائی جاسکتی ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔“ (تقریر میاں محمد طفیلؒ اجتماع الہ آباد، اپریل ۱۹۴۶ء، روداد جماعت اسلامی، چہارم، صفحہ ۳۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی کے اگلے کچھ مراحل ان کے ذہن میں موجود تھے لیکن وہ اس وقت ان کی اشاعت کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اسی سے رشید صاحب کا یہ اعتراض بھی رفع ہوتا ہے کہ تنظیم اسلامی تحریک اصلاح کو نام نہاد ”انقلابی جدوجہد“ کے محض ابتدائی مرحلے میں مقید کرتی ہے، حالانکہ یہ خود اہل جماعت کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔

بلاشبہ یہ سعادت ڈاکٹر اسرار احمد کے حصے میں آئی کہ سیرت النبی ﷺ کے گہرے مطالعے کے بعد انہوں نے ایک مربوط منہج انقلاب پیش کیا۔ بلاشبہ آپ کی کتاب ”منہج انقلاب نبویؐ“ اس موضوع پر ایک جامع کتاب ہے۔ آپ نے بیان فرمایا کہ تحریک کے ابتدائی مراحل، دعوت، تربیت، تنظیم اور صبر محض تو نبی اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق ہی طے کیے جائیں گے۔ اس دوران دعوت و تبلیغ و تربیت و تنظیم اور اس کے ساتھ امر بالمعروف اور خصوصاً نبی عن المنکر باللسان میں مشغول رہا جائے۔ بعد کے مراحل میں تو نبی اکرم ﷺ نے مسلح جنگ کا راستہ اختیار کیا تھا۔ لیکن چونکہ ہم جس معاشرے میں کام کر رہے ہیں اس میں مسلمان ہی مد مقابل ہیں لہذا یہاں پر جنگ کے بجائے نبی عن المنکر بالید کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آپ اس کے لیے حدیث مبارکہ پیش کرتے ہیں کہ ”تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے بدلنے کی کوشش کرے اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے۔“ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اس حدیث مبارکہ کے اسلوب پر غور و تدبر سے یہ لازمی تقاضا سامنے آتا ہے کہ منکر کو مٹانا،

اسے برا کہنا اور اسے برا سمجھ کر اس سے نفرت کرنا ہر مسلمان پر واجب اور فرض ہے۔ سب سے

نچلے درجے پر ہرگز قانع نہیں ہونا چاہئے، بلکہ لازم ہے کہ طاقت حاصل کرنے اور جمعیت فراہم

کرنے کے لئے دل و جان سے کوشش کی جائے۔ لوگوں کو تیار کیا جائے کہ منکرات کو مٹانے اور بدلنے کے لئے اپنی جانیں تک دینے کے لئے آمادہ ہوں۔ جب تک طاقت حاصل نہ ہو زبان سے بھی منکر کو منکر کہنے کا عمل جاری رہے۔ صاحبانِ اقتدار کو نرم و گرم طور پر اس طرف متوجہ کیا جاتا رہے۔ اس دوران دل میں منکرات کے خلاف نفرت پروان چڑھتی رہے تاکہ جب ان کو طاقت و قوت کے ساتھ بدلنے کا مرحلہ آئے تو جذبات میں منکرات کے خلاف جوش و خروش کا طوفان موجزن ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مسلمان ماحول کے رنگ میں رنگا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دل کی نفرت کم ہو اور پھر ماحول اس پر چھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کل وہ جس کام کو برا کہہ رہا تھا اور برا سمجھ رہا تھا آج وہ خود اس میں ملوث ہو جائے۔“ (منہج انقلاب نبوی، صفحہ ۳۵۴)

احتجاجی طریق کار کی تائید دیگر علماء کرام بھی کرتے ہیں۔ علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں: ”منکر کو روکنے کی تیسری شرط اسے روکنے کی طاقت رکھنا ہے، گویا منکر کو روکنے والا ذاتی طور پر اپنا اپنے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ مل کر بالفعل یہ طاقت رکھتا ہو کہ منکر کو قوت کے ساتھ روک سکے۔۔۔ منکر کو روکنے کے مسئلے میں ایک مشکل اس وقت کھڑی ہو جاتی ہے جب صاحبِ قوت و اختیار یعنی حکومت ہی برائی کی مرتکب ہو تو پھر افراد اور جماعتیں اس منکر کو کیسے روکیں جس میں حکومت ملوث ہو رہی ہو یا پشت پناہی کر رہی ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے افراد اور جماعتیں اتنی قوت کے مالک بنیں جو اس برائی کو روک سکیں۔“ (میشاق، مئی ۲۰۱۳، صفحہ ۶۰)

علامہ یوسف القرضاوی مزید لکھتے ہیں:

”عوام طاقت ہیں، عوام کی ملکی سطح کی ایسی فیصلہ کن قوت ہوتی ہے جسے اجتماع سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جب یہ قوت حرکت میں آجائے تو کسی میں ہمت نہیں ہوتی کہ اس کا سامنا کرے یا اس کا راستہ روکے۔ یہ قوت اپنی تندی اور تیزی میں ٹھانٹیں مارتے سمندر یا سب کچھ بہا لے جانے والے سیلاب کی طرح ہوتی ہے کہ کوئی شے، حتیٰ کہ مسلح قوتیں بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔ یہ مسلح قوتیں بھی تو اسی کا حصہ ہوتی ہیں اور یہ عوام ان قوتوں کے افرادِ خاندان، باپ، بیٹے اور بھائی ہی تو ہوتے ہیں۔“ (میشاق، مئی ۲۰۱۳، صفحہ ۵۷، ۵۹، ۶۰)

مفتی تقی عثمانی صاحب نے اپنے مضمون ”حکومت کی معزولی“ (شائع شدہ، میثاق دسمبر ۲۰۱۳ء) میں ”شرعی ہڑتال“ کے دلچسپ نام سے، سول نافرمانی پر عمدہ کلام فرمایا ہے۔ حضرت لکھتے ہیں:

”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شریعت میں حکومت پر دباؤ ڈالنے کا اور کوئی طریقہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ حقیقت میں شریعت نے ایک راستہ ایسا تجویز کیا ہے کہ اگر قوم اس پر عمل کر لے

تو بڑی سے بڑی جاہر حکومتوں کے گھٹنے چند گھنٹوں میں ٹکوائے جاسکتے ہیں اور وہ راستہ یہ ہے کہ اس اصول پر عمل کیا جائے کہ:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) (الحامع الصغير)

للسیوطی، ح: ۹۹۰۳، عن عمران بن الحصین)

”خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔“

جب ایک مرتبہ یہ اصول مان لیا جائے کہ کسی مخلوق کے حکم پر خالق کی نافرمانی نہیں کی جاسکتی تو جتنے غیر اسلامی احکام نافذ ہیں، ساری قوم اگر ان میں شرکت سے انکار کر دے تو اندازہ کیجئے کہ حکومت کے پاس کیا چارہ کار رہ جاتا ہے؟ فرض کیجئے کہ عدالتوں میں بیٹھنے والے جج اگر یہ کہہ دیں کہ جب تک ہمیں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا، اُس وقت تک ہم عدالتوں میں کام نہیں کریں گے اور وکلاء یہ کہہ دیں کہ جب تک قوانین شریعت کے مطابق نہیں ہو جاتے ہم عدالتوں میں بحیثیت وکیل کے پیش نہیں ہوں گے اگر بینک کے ذمہ دار اور بینک کے ملازمین یہ کہہ دیں کہ جب تک بینکاری کا نظام سود سے پاک نہیں ہو جاتا، ہم بینکوں میں کام نہیں کریں گے اور اگر عوام یہ کہہ دیں کہ جب تک بینکوں کا نظام سود سے پاک نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک ہم بینکوں میں پیسے نہیں رکھوائیں گے اور تا جریہ کہہ دیں کہ جب تک بینک سود سے پاک نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک ہم اس سے تمویلی معاملات نہیں کریں گے۔ اگر ”لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ“ کی بنیاد پر جوان کی شرعی ذمہ داری ہے، سارے عوام مل کر غیر شرعی احکام کی تعمیل سے انکار کر دیں تو آپ ذرا تصور کریں کہ جس دن یہ ہڑتال ہوگی اُس دن چند گھنٹوں میں حکومت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہ شرعی ہڑتال ہے۔“

پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف لکھتے ہیں:

”دور حاضر میں کسی بھی مسئلے کے بارے میں اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے اور مخالف قوتوں سے اظہار ناراضگی کرنے کے اور حکومت کے خلاف سیاسی و جمہوری جدوجہد کرنے کے طریقے جیسے، جلوس اور ہڑتال وغیرہ ہیں۔ اس لیے اکثر علماء کے نزدیک ان ذرائع کے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بہت سے اسلامی ملکوں میں بھی جن میں پاکستان، ایران، ترکی، انڈونیشیا، ملائیشیا، اور بہت سے دوسرے کئی ممالک شامل ہیں لوگ اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے یہی طریقے اختیار کرتے ہیں۔“

(پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف، ششماہی منہاج، لاہور، جنوری تا جون ۲۰۰۵ء، صفحہ ۶۲)

چوتھا اعتراض:

محمد رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”سوال یہ ہے کہ طریق کار کے چوائس کے ضمن میں جو حق اور آزادی آپ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں تو آپ کس انتہائی اور دلیل کی بنیاد پر دوسروں سے اپنی رائے سے مختلف طریق کار اختیار کرنے پر ان سے چوائس کا حق چھین لینا چاہتے ہیں؟ کیا ”احتجاجی سیاست“ آسمان سے اتر اہوا کوئی صحیفہ ہے جس کو مضبوطی سے تھام لینے کی صبح شام آپ دعوت دیے چلے جا رہے ہیں؟ اور کیا ”انتخابی سیاست“ قرآن و سنت کی کسی بھی نص سے ”کار حرام“ ثابت ہوتا ہے جسے آپ دینی جماعتوں کے لیے شجر ممنوعہ ثابت کرنے میں عقل و منطق کی کوئی دلیل بھی رائیگاں نہیں جانے دیتے؟“۔

جواب:

فاضل مضمون نگار کے لب و لہجے کی تلخی اور کڑواہٹ ہمارے لیے ناقابل فہم ہے، بالخصوص اس تناظر میں کہ وہ ”اصلاح“ کے اس تصور کے علمبردار ہیں جو عاجزی، انکساری اور عبدیت اور انسانی ہمدردی و غم خواری سے عبارت ہے، تاہم ان کے اس لب و لہجے پر کوئی تبصرہ کیے بغیر ہم ان کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ ان کا ہم پر یہ اعتراض درست نہیں کہ ہم دوسروں کو طریق کار کی چوائس کا حق نہیں دیتے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ ہم نے کبھی یہ حق چھینا ہی نہیں۔ میثاق کی اسی تحریر میں جس پر جناب نے تبصرہ فرمایا ہے، امیر تنظیم اسلامی کے یہ الفاظ موجود ہیں ”میں یہ اعتراف کروں گا کہ بدلے ہوئے حالات میں کسی نئے طریقے پر غور کرنا بالکل قابل فہم ہے اور عقل و دانش اسے تسلیم کرتی ہے“ (میثاق، اکتوبر ۲۰۱۳ء صفحہ ۳۲)۔ غور فرمائیے ان الفاظ سے دوسروں کو طریق کار کی چوائس کا حق دیا جا رہا ہے یا چھینا جا رہا ہے؟ ہماری اس بات کی دلیل ہمارا یہ رویہ بھی ہے کہ ہم نے دوسرے طریقے حتیٰ کہ الیکشن تک کو کبھی حرام نہیں کہا۔ نہ اس طریقے کے عاملین کو ضال و مضل قرار دیا ہے اور نہ ہی ان کے اخلاص پر شبہ کیا ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں ہمارا موقف معروف ہے لیکن ہم پیش کیے دیتے ہیں۔ بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

(i) ہمارے نزدیک تاریخ انسانی میں آج تک کوئی انقلاب انتخابات کے ذریعے نہیں آیا۔ (واضح رہے کہ انقلاب سے مراد Politico Socio Economic System میں کوئی بنیادی تبدیلی ہے) یہ بات تاریخی طور پر طے شدہ ہے۔

(ii) ہمارے نزدیک الیکشن پہلے سے قائم کسی نظام کو چلانے کے لیے ہوتے ہیں، کسی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے نہیں۔ امریکہ میں دونوں انتخابی حریف یعنی Democrats اور

Republicans امریکہ میں قائم نظام پر متفق ہیں۔ ان کے مابین فرق صرف پالیسی سے متعلق بعض معاملات میں ہے۔

(iii) الیکشن خواہ کتنے ہی صاف و شفاف اور غیر جانبدارانہ و منصفانہ کیوں نہ ہوں، معاشرے میں موجود جو بھی اقتصادی Power bases ہوں گے یا بالفاظ دیگر معاشی و اقتصادی ڈھانچے پر جن طبقات کا تسلط ہوگا، ان انتخابات کے نتائج میں انہی کی reflection (عکاسی) ہوگی۔ اگر وہاں جاگیرداری نظام قائم ہے تو کوئی جاگیردار ہی انتخابات کے ذریعے اوپر آئے گا۔ اسی پچاسی فیصد نشستوں پر وہی قابض ہوں گے، باقی پندرہ بیس فیصد محض ڈگڈگی بجاتے رہ جائیں گے۔

مذکورہ بالا تین نکات سے ہم جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ یہ ہے کہ نظام اسلام کے قیام کے لیے الیکشن میں حصہ لینا "Exercise in futility" کے سوا کچھ نہیں ہے، یہ محض قوت اور وقت کا ضیاع ہے۔ تاہم الیکشن کے بارے میں اپنے اس موقف کا بھی میں ہمیشہ اظہار کرتا رہا ہوں کہ یہ حرام نہیں ہیں۔ میں نے مولانا صوفی محمد صاحب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کئی بار کیا ہے جو مالکنڈ کی تحریک نفاذ شریعت کے قائد ہیں۔ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ الیکشن میں ووٹ دینا بھی حرام ہے اور الیکشن لڑنا بھی حرام ہے۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا تھا۔ دیر کے ایک دور دراز علاقے میں "میدان" نام کا ایک مقام ہے، جہاں صوفی صاحب رہائش پذیر تھے۔ میں ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچا اور عرض کیا کہ مولانا میں اس حد تک آپ سے متفق ہوں کہ الیکشن کا اس لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے سے دین نہیں آسکتا، لیکن آپ اس کو حرام کہہ رہے ہیں تو اس کے لیے کوئی وزنی دلیل درکار ہے۔ اس کے لیے آپ کو علماء کے سامنے اپنے دلائل پیش کر کے ان کا اتفاق رائے حاصل کرنا چاہیے۔ میں بہر حال اسے حرام نہیں کہہ سکتا اور میں نے کبھی بھی اس کو حرام قرار نہیں دیا۔

دوسرے، میں یہ بھی ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ جو لوگ خلوص و اخلاص کے ساتھ قائل ہیں کہ اس ذریعے سے یہاں واقعتاً کوئی تبدیلی آسکتی ہے، اسلامی نظام آسکتا ہے تو وہ ضرور اس کے لیے کام کریں، تاہم ایسے لوگوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ باہم متحد ہو جائیں، تاکہ اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لینے والے تو ایک پلیٹ فارم پر آجائیں۔ اگر آپ نے اسلام کو ایک پارٹی ایشو بنا ہی لیا ہے تو معاشرے میں اسی بنیاد پر polarization ہو جانی چاہیے۔ سیکولر ذہن کے لوگ ایک طرف ہوں اور مذہبی ذہن کے لوگ ایک طرف اور اگر مذہبی کمپ پانچ حصوں میں بٹا ہوا ہوگا تو پھر وہی کچھ ہوگا جو اب تک ہو رہا ہے کہ دن بدن عزت کا دھیلا ہو رہا ہے۔ علماء کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ان کے کچھ بیانات ضرور اخبارات میں چھپ جاتے ہیں لیکن ہم دیکھ رہے

ہیں کہ معاشرے پر علماء کی گرفت بندرتج ذہیلی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور یہ سارا نتیجہ اس غلط حکمت عملی کا ہے جو ان کی طرف سے اختیار کی گئی ہے۔

(مذہبی جماعتوں کے باہمی تعاون کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی مساعی، صفحہ ۵۱، تا ۵۳)

پس ہماری رائے ہے کہ الیکشن نفاذ اسلام کے لیے سودمند نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے اور اس ذریعے سے اسلامی انقلاب نہیں آسکتا۔ البتہ اگر کوئی یہ راستہ اختیار کرتا ہے تو ہم اسے حرام نہیں سمجھتے لیکن اختلاف کا اظہار کریں گے اور اسے اس راستے کی طرف لانے کی کوشش بھی کریں گے جسے ہم دیکھنا صحیح راستہ سمجھتے ہیں۔ ہم فاضل مضمون نگار کو یاد دلانا اور ان کی وساطت سے قارئین البرہان کو یہ بھی بتانا چاہیں گے کہ بانی تنظیم نے بطور بالا میں جس وسعت قلبی کا اظہار کیا اس کا عملی ثبوت یوں فراہم کیا کہ دینی سیاسی جماعتوں نے 2004ء میں ایم ایم اے کی صورت میں جب متحد ہو کر الیکشن لڑنے کا اعلان کیا تو محترم ڈاکٹر صاحب نے ان کی حمایت میں ایک اخباری اشتہار کی صورت میں لوگوں سے اپیل کی کہ نفاذ شریعت کی خاطر قوم کو چاہیے کہ ایم ایم اے کو ووٹ دے۔

اگرچہ مضمون نگار کی نگاہ میں ہمارا صبح و شام، احتجاجی تحریک کی طرف بلانا مناسب نہیں لیکن ہم اس کے باوجود اس کی طرف بلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی راستہ ہمارے خیال میں درست ہے۔ پھر اب تو انتخاب میں متحرک لوگوں کے ذہن میں بھی انتخابی راستے کے حوالے سے عدم اطمینان پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ہمارا اشارہ امیر جماعت اسلامی جناب منور حسن صاحب مدظلہ کے ”اشارات“ کی طرف ہے جو جون ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے فوراً بعد، ترجمان القرآن میں شائع ہوئے۔ انتخابی دھونس و دھاندلی کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

”تو بجا طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس انتخابی عمل کی کتنی اصلاح ممکن ہے؟ اور سیاسی قیادت کو بروئے کار لانے کا یہ طریقہ کہاں تک تبدیلی یا انقلاب کے لیے نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے؟“۔

”یہ احساس بجا طور پر پایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی اس کامیابی سے دور نظر آتی ہے جو ہمارے پیش نظر تھی اور جو نظم جماعت، امیدواران اور کارکنان کی آراء اور تجزیے کے نتیجے میں محسوس ہوتی تھی۔ بہت چھوٹے دائرے میں کامیابی ہوئی۔ کارکن اگرچہ اس لحاظ سے مطمئن ہوتا ہے کہ ہماری جدوجہد دین کے غلبے کی جدوجہد ہے اور ہمارے ذمے اپنے حصے کا کام کرنا ہے لیکن یہ بات پھر بھی درست ہے کہ ہم الیکشن کو تبدیلی کا ایک ذریعہ سمجھتے رہے اور سمجھتے ہیں، اس لیے یہ کارکردگی اور نتائج کئی سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ جن پر سنجیدہ غور و فکر اور ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور آبادی کے لحاظ سے منظر نامے کو سامنے رکھ کر مؤثر حکمت عملی اور نقشہ کار تیار کرنے کی ضرورت ہے۔“۔

”اس پس منظر میں کچھ اور بھی بنیادی سوالات ذہنوں میں کروٹیں لے رہے ہیں۔ خصوصیت سے ترکی، عرب دنیا، ملائیشیا اور دوسرے مسلم ممالک میں اسلامی قوتوں نے جو تجربات کیے ہیں، ان کو بھی غور سے دیکھنے اور ان کے تجربات کی روشنی میں سیکھنے کی ضرورت ہے لیکن اپنے حالات کے مطابق نئی راہوں کی تلاش نہ صرف یہ کہ شجر ممنوعہ نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بنتی جا رہی ہے۔ بلاشبہ یہ راہ مسائل اور مشکلات سے عاری نہیں اور اپنی پیچیدگیاں بھی رکھتی ہے اور امکانات بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نمل بے جوڑ پیوند کاری سے اجتناب کیا جائے اور اپنے حالات کے مطابق ایک سوچے سمجھے عمل کے ذریعے تسلسل کو مجروح کیے بغیر تبدیلی اور نئے تجربات کے امکانات کا جائزہ لیا جائے اور مفید اور قابل عمل اقدامات سے گریز نہ کیا جائے۔“

یہاں بانی جماعت اسلامی مولانا مودودیؒ کے الفاظ بھی یاد کر لینے چاہئیں کہ:

”اگر پرامن ذرائع سے جوہر اقتدار ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔“

(تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل صفحہ ۱۰۶)

محترم محمد رشید صاحب، خدارا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اب جب کہ ساٹھ سالہ انتخابی جدوجہد سے جوہر اقتدار ہاتھ نہیں آ سکا بلکہ حالیہ الیکشن کے نتائج بتا رہے ہیں کہ اس میدان میں دینی جماعتوں کا گراف مزید نیچے گر چکا ہے، تو کیا عقل عام، دانشمندی اور اخلاص کا یہ تقاضا نہیں ہوگا کہ آئندہ انتخابی سیاست کے اجتہادی راستے کو چھوڑ کر دیگر جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ جب کہ وہ دیگر جائز شرعی ذریعہ جو تنظیم اسلامی کے پیش نظر ہے، اس کی تصویب و تائید سطور بالا میں علامہ یوسف قرضاوی، مولانا مفتی تقی عثمانی جیسے جید علماء اور اکابر ملت کی تحریروں کے ذریعے ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ 2010ء میں پاکستان بھر کے اکابر دیوبند کے سہ روزہ اجلاس کا حاصل جس منفقہ اعلامیہ کی صورت میں سامنے آیا، اس میں بھی اس کی بھرپور تصویب و تائید موجود ہے۔ پرامن احتجاجی تحریک بھی چونکہ حرام نہیں بلکہ ایک جائز ذریعہ ہے لہذا انتخابات سے کنارہ کش ہوتے ہوئے، انقلابی یا تحریکی طرز پر کام شروع کیا جائے۔ پھر اسی خاص نقطہ نظر سے ان کارکنان کی تربیت کی جائے اور جب جماعت مضبوط ہو جائے تو پھر ایک بھرپور احتجاجی تحریک کے ذریعے باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی جائے۔

فاضل مضمون نگار نے اپنی تحریر میں تنظیم اسلامی کے اساسی نظریات پر مشتمل بعض کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ تنظیم اسلامی کا رویہ ان فکری بنیادوں کے برعکس ہے۔ موصوف کی تنقید اور اپنے کردار کا جائزہ لینے کے بعد ہم دیانتاً یہ سمجھتے ہیں کہ بھلا اللہ تنظیم اسلامی نظری اور فکری طور پر انہی نظریات پر گامزن ہے جو ان کتابوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ عملی طور پر ہمیں کتنی کامیابی مل سکی، یہ ایک الگ بحث

ہے۔ تربیتی پروگراموں میں تنظیم کی ”قراردات سبس“ کا بار بار مطالعہ اور اس کے تناظر میں تنظیم کے موجودہ رویہ کا خود احتسابی کے انداز میں جائزہ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے معمولات کا مستقل جزو ہے۔ تاہم ہم اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ توسیع دعوت اور تربیت و تزکیہ کے بعض پہلوؤں سے ہم ابھی معیار مطلوب سے پیچھے ہیں۔

حرف آخر:

محمد رشید صاحب کی طرف سے پیش کیے گئے اعتراضات کے جوابات میں ہم نے جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے لٹریچر سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ یہ اقتباسات ثابت کرتے ہیں ہے کہ پیش کیے گئے اعتراضات درست نہیں ہیں۔ ان اعتراضات کا سبب بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ معترض نے وقتِ نظر سے جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا۔ مناسب یہی ہوتا ہے کہ کسی شخصیت، جماعت یا تحریک کی فکر اور طریق کار پر اعتراض سے قبل اُس کے لٹریچر سے متعلقہ مواد کے ہر پہلو کا مطالعہ کر لیا جائے۔ موصوف کے پیش کردہ اہم اعتراضات کا جواب بحمد اللہ ہم نے دے دیا ہے۔ البتہ ہماری رائے میں موصوف نے چند اور ضمنی اعتراضات بھی کیے ہیں۔ اگر موصوف ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تصانیف ”برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کے تعمیل و تجدید اور اس سے انحراف کی راہیں“ اور ”تحریک جماعت اسلامی..... ایک تحقیقی مطالعہ“ کا بغور مطالعہ فرمائیں تو انہیں اپنے ان اعتراضات کا جواب بھی مل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں خلوص کے ساتھ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مثبت انداز سے اپنی توانائیاں لگانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

انا لله وانا اليه راجعون

عالم اسلام کے عظیم مفکر، ادیب اور دانشور سید قطب شہیدؒ کے بھائی پروفیسر محمد قطب ۴/اپریل ۲۰۱۴ء کو سعودی عرب میں جلاوطنی کی حالت میں مکہ مکرمہ میں وفات پا گئے۔ انا لله وانا اليه راجعون۔ ان کی عمر ۹۵ سال تھی اور وہ کافی عرصہ سے علیل تھے۔

ان کی تصانیف میں سے ’بیسویں صدی کی جہالت‘، ’اسلام- غلط سمجھا گیا دین‘، ’اسلام کے بارے میں شبہات‘، ’اسلامی بیداری‘ اور ’مستقبل اسلام کا ہے‘ زیادہ معروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے اور ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے۔

مسلم ممالک کے باشندوں کے لیے بلا د کفار کی شہریت غیر شرعی ہے (آخری قسط)

غیر مسلم ممالک کی شہریت اور اس کے لیے حلف اٹھانا

ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم ریاست کی شہریت اختیار کرنا صرف غیر مسلموں کے ساتھ مستقل رہائش اختیار کرنا ہی نہیں ہے جس سے شریعت کئی ممکنہ مفاسد کی وجہ سے منع کرتی ہے، جیسا کہ سطور بالا میں گزر چکا، بلکہ یہ اس سے کہیں بڑھ کر ایک بڑا اور سنجیدہ معاملہ ہے کیونکہ تہذیب اور معاشرے کی طرح ہر ریاست بھی کسی نہ کسی نظریے پر کھڑی ہوتی ہے اور جیسا کہ معروف و معلوم ہے کہ اس زمین پر جب سے انسان موجود ہے، زندگی گزارنے کے لیے اس کے سامنے دو ہی بنیادی نظریے رہے ہیں: ایک اللہ کی بڑائی کو تسلیم کر کے اور اس کی عبودیت اختیار کر کے زندگی گزارنے کا نظریہ (یعنی توحید و رسالت اور آخرت) جسے اسلام کہا جاتا ہے اور دوسرے غیر اسلام یعنی اللہ کی بڑائی کو تسلیم کرنے کی بجائے یا دوسرے لفظوں میں اس کی بڑائی کا انکار (یعنی کفر کرتے ہوئے) انسان کا خود کو بڑا، آزاد اور خود مختار سمجھنا اور زندگی اپنی عقل، اپنے تجربہ و مشاہدہ اور اپنی خواہشات (ہوائے نفس) کے مطابق گزارنا۔ چنانچہ مغربی تہذیب (جو آج دنیا پر غالب ہے) اس دوسرے گروپ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی نظریاتی بنیاد یہ ہے کہ انسان آزاد و خود مختار ہے اور اپنی زندگی گزارنے کے بارے میں سارے فیصلے خود کر سکتا ہے اور وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہے کہ اس کی مرضی پر چلے (ہیومنزم)۔ اور اگر کسی نے خدا اور مذہب کو ماننا ہے تو اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن انسان کی اجتماعی اور ریاستی زندگی میں خدا اور مذہب کو دخل دینے کا بہر حال کوئی حق نہیں ہے (سیکولرزم)۔ اور یہ کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور زیادہ سے زیادہ مال کمانا اور زیادہ سے زیادہ دنیاوی سہولتیں اور آسائشیں حاصل کرنا ہی انسانی کوششوں کا مرکز و محور ہونا چاہیے (نظام سرمایہ داری یا کیپٹل ازم)۔ اور علم اور حقائق کا منبع انسانی عقل اور اس کا تجربہ و مشاہدہ (یعنی حسی علم) ہے نہ کہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کوئی پیغام ہدایت۔ اور انسان چونکہ آزاد اور خود مختار ہے لہذا عوام اپنے جن نمائندوں کو حکومت چلانے کے لیے منتخب کرتے ہیں وہ بھی آزاد اور مختار ہوتے ہیں اور جس چیز کو چاہے حلال اور جس کو چاہے حرام قرار دے سکتے ہیں (یعنی جمہوریت اور پارلیمنٹ کی بالادستی کا تصور) چنانچہ مغربی ممالک کے پارلیمان زنا، شراب، جوئے، فحاشی وغیرہ کو حلال قرار دے چکے ہیں۔

یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر مغربی تہذیب، معاشرے اور ریاست کی بنیادیں کھڑی ہیں اور جن کا اظہار وہاں کے دستاویز میں ہوتا ہے جن کے مطابق کہ ریاست کا نظم و نسق چلایا جاتا ہے۔ یہ امریکی اور یورپی ریاستیں اگر یہودیت اور عیسائیت پر مبنی ہوتیں تو بھی یہ بلاد کفار ہی تھیں لیکن یہ جن نظریات پر کھڑی ہیں وہ تو خالص شرک اور کفر ہے لہذا یہ ممالک بلاشبہ بلاد کفار ہیں بلکہ مسلمان ممالک کے خلاف مسلسل جارحانہ حملوں کی وجہ سے یہ بلاد الحرب ہیں۔

اب آئیے ان مغربی ممالک، بلاد کفار کی شہریت لینے کے لیے اٹھائے جانے والے حلف کی طرف۔ طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی ریاست کا شہری بننا چاہتا ہے تو وہ یہ عہد کرتا اور حلف لیتا ہے کہ وہ ریاست کے آئین و قوانین اور اصول و اقدار کی پیروی کرے گا اور اس ملک کی حفاظت و خود مختاری کے لیے جان لڑا دے گا۔ چنانچہ امریکی شہریت اختیار کرتے ہوئے جو حلف لینا پڑتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

" I hereby declare, on oath, that I absolutely and entirely renounce and abjure all allegiance and fidelity to any foreign prince, potentate, state, or sovereignty of whom or wich I have heretofore been a subject or citizen: that I will support and defend the Constitution and Laws of United States of America against all enemies, foreign and domestic; that I will bear true faith and allegiance to the same; that I will bear arms on behalf of the United States when required by the law; that I will perform noncombatant sevice in the Armed Forces of the Unites States when required by the law; that I will perform work of national importance under civilian direction when required by the law; and that I take this obligation freely without any mental resevation of purpose of evasion; so God help me "

ترجمہ: ”میں حلفیہ اعلان کرتا ہوں کہ اس سے پہلے میں جس ریاست کا شہری تھا اور جس حاکمیت اعلیٰ اور حکمرانوں کا پیروکار تھا، میں ان سے مکمل دستبرداری اور برأت کا اعلان کرتا ہوں؛ اور یہ کہ میں

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آئین اور قوانین پر مکمل ایمان رکھتے ہوئے ان کا پوری طرح وفادار رہوں گا اور اندورنی و بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں ان کی مکمل حمایت اور ان کا دفاع کروں گا اور جب قانون کا مطالبہ ہو گا تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دفاع کے لیے ہتھیار اٹھاؤں گا اور اس کی افواج میں سولین خدمات انجام دوں گا؛ اور یہ کہ قانون کے مطابق قومی اہمیت کی خدمات انجام دوں گا؛ اور یہ کہ میں اپنی آزاد مرضی سے، بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اور عمل درآمد سے بچنے کی نیت کے، اس ذمہ داری کو اٹھانے کا عہد کرتا ہوں سو اللہ اس میں میری نصرت فرمائے۔“

اور کینیڈا کی شہریت اختیار کرتے ہوئے جو حلف لینا پڑتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"From this day forward, I pledge my loyalty and allegiance to Canada and Her Majesty Elizabeth the Second, Queen of Canada. I promise to respect our country's rights and freedoms, to uphold our democratic values, to faithfully observe our laws and fulfill my duties and obligation as a Canadian citizen"

ترجمہ: ”آج کے بعد میری ہر طرح کی وفاداری کا مرکز و محور کینیڈا اور اس کی عزت مآب ملکہ الزبتھ ثانی ہوں گی۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میں اپنے ملک کے حقوق اور آزادیوں کا احترام کروں گا، اس کی جمہوری اقدار کا تحفظ کروں گا؛ ملکی قوانین کی صدق دلانہ اطاعت کروں گا اور کینیڈا کے شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ادا کروں گا۔“

حلف کی ان عبارتوں کو زبان سے دہرانا اور ان کو قبول کرتے ہوئے تحریراً و توثیقاً دستخط کرنا بظاہر اسلام پر ایمان کی نفی ہے کیونکہ ایسا کرنے والا علی الاعلان اور عہداً اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت اور مسلم ریاست (دارالسلام) کی ولایت سے دست بردار ہوتا ہے اور وہ بلاد کفر کے غیر اسلامی قوانین اور اصول و اقدار پر عمل کا اور دارالکفر کے لیے جان لڑانے کا عہد کرتا ہے۔ واضح رہے کہ امریکہ، برطانیہ جیسے ممالک جن کی بنیاد مغربی فکر و تہذیب پر ہے بلاشبک و شبہ وہ دارالکفر ہیں بلکہ مسلمانوں سے معاندانہ رویہ رکھنے کی بنیاد پر دارالحرب ہیں۔ چنانچہ مولانا ادریس کاندھلویؒ کہتے ہیں کہ (۱) اسلامی احکام پر عمل کی آزادی نہ ہونے کی وجہ سے امریکہ و برطانیہ دارالحرب ہیں۔ (۲) کیونکہ وہ نہ صرف کفر پر عامل ہیں بلکہ کفر کے علم بردار ہیں۔ وہاں اسلامی احکام پر عمل کی آزادی نہیں ہے بلکہ ان پر اتنا ہی عمل کیا جاسکتا ہے جس کی وہاں کی حکومت اور قانون اجازت دیں اور وہ کفر کو دنیا پر غالب کرنا چاہتے ہیں اور کئی مسلم ممالک کے خلاف

حالت جنگ میں ہیں لہذا اس طرح کا حلف اٹھانا اپنے دین کی نفی کرنا ہے۔

کفار کے قوانین کی اطاعت تو دور کی بات ہے قرآن حکیم تو ان مسلمانوں کے دین کی بھی نفی کرتا ہے جو نبی کریم ﷺ کے فیصلوں پر دل سے راضی نہ ہوں:

”فلا وربک لا يؤمنون حتی یحکمواک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی

انفسہم حرجا مما قضیتو یسلموا تسلیما۔“ (النساء ۴: ۶۵)

”پس اے نبی ﷺ! آپ ﷺ کے رب کی قسم! ایسے لوگ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام باہمی جھگڑوں میں آپ ﷺ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو فیصلہ آپ ﷺ فرمائیں اس پر وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ دل و جان سے اسے تسلیم کریں۔“

چنانچہ سعودی دارالافتاء کے سابق سربراہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ بلاد کفار کی شہریت قبول کرنے اور ان کے قوانین کی اطاعت اور ان پر عمل ایک نوع کا شرک ہے (۳) شیخ کے الفاظ یہ ہیں ”بخشی علیہ ان یقع فی الشرک، لانہم اذا عطاہ الجنسیۃ قد یلزمونہ لقوانین وشرائط“، یعنی ڈر ہے کہ وہ شرک میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ جب وہ اسے اپنی شہریت دیں گے تو اسے اپنے قوانین اور شرائط کا پابند کر لیں گے۔“

علامہ رشید رضا مصری نے اسے ارتداد، ملت سے خروج اور قابل قتل جرم قرار دیا ہے۔ ان سے جو سوال کیا گیا اور انہوں نے اس کا جو جواب دیا وہ ملاحظہ ہو:

وقد سئل الشیخ محمد رشید رضا عن تجنس المسلم بجنسیۃ تنافی الاسلام .
کما هو حاصل فی بلاد تونس آنذاک . وما یتضمنہ هذا التجنس من انکار لما هو
معلوم من الدین بالضرورة، والوقوف مع الکفار عسکریاً لقتال المسلمین... اخ.
فکان من جوابہ .:

”اذ كانت الحال كما ذكر في هذا السؤال، فلا خلاف بين المسلمين في أن
قبول الجنسية ردة صريحة، و خروج من الملة الاسلامية، حتى أن الاستفتاء فيها يعد
غريباً في مثل البلاد التونسية التي يظن أن عوامها لا يجهلون حكم ما في السؤال....
من الأمور المعلومة من الدين بالضرورة...“

الی أن قال ، ان قبول المسلم لجنسية ذات أحكام مخالفة لشریعة الاسلام

خروج من الاسلام فانہ ردلہ، وتفصیل لشریعة الجنسیة الجديدة علی شریعتہ،
ویکفی فی هذا أن یکون عالماً بکون تلک الأحکام التی

آثر غیرہا علیہا ہی أحکام الاسلام فلا یعامل معاملة المسلمین، واذا وقع من
أهل بلد أو قبيلة و جب قتالہم علیہ حتی یرجعوا۔^(۴)

ترجمہ: ”شیخ رشید رضا سے ایسی شہریت لینے کے بارے میں پوچھا گیا جس میں اسلام کی مخالفت ہو یا جس کے معنی کہ اس میں ضروریات دین کا انکار ہو اور مسلمانوں کے خلاف قتال میں کفار کا ساتھ دینا پڑے۔ جیسا کہ ان دنوں تیونس میں ہو رہا تھا، تو انہوں نے جواب دیا کہ ”اگر حالات ویسے ہوں جیسا کہ سوال میں ذکر کیے گئے ہیں تو مسلمانوں میں اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس طرح شہریت لینا صریح ارتداد اور ملت اسلامیہ سے خروج کے مترادف ہے بلکہ تیونس جیسے اسلامی ملک سے اس طرح کے سوال کا آنا ہی تعجب خیز ہے کہ وہاں کے مسلمانوں سے مستبعد ہے کہ وہ ایسے واضح حکم کو نہ جانتے ہوں گے۔“

’الدین بالضرورة‘ کے حوالے سے شیخ نے کہا: ”ایسے ملک کی شہریت قبول کرنا جس کے قوانین خلاف شریعت ہوں، ارتداد اور اسلام سے خروج کے مترادف ہے کیونکہ یہ وضعی قوانین کو شریعت پر فوقیت دینا ہے۔ اور اگر ایسے شخص کو معلوم ہو کہ جن قوانین کو وہ قبول کر رہا ہے وہ خلاف اسلام ہیں تو اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ نہیں کیا جائے گا اور اگر ایسا کرنے والو کوئی گروہ یا قبیلہ ہو تو ان کے خلاف قتال جائز ہے جب تک کہ وہ اس سے رجوع نہ کریں۔“

مصر کی افتاء کمیٹی نے شیخ علی محفوظ کی صدارت میں یہی فتویٰ دیا تاہم ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ دیکھا جانا چاہیے کہ ایسی شہریت قبول کرنے والا ’مضطرب‘ ہو کہ اسے مسلم ملک کے ظالم و جابر حاکم سے جان و مال و آبرو کا حقیقی خطرہ درپیش ہو، وہ بلاد کفر میں رہائش کو پسند نہ کرتا ہو اور وہاں حسب استطاعت اسلامی زندگی گزارنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اسی طرح متعلقہ ملک کے حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ دار الحرب ہے یا معاد ملک، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا رویہ کیسا ہے؟ اور اس مسلم ملک کے حالات کیسے ہیں جہاں سے بھاگ کر کوئی مسلمان کسی کافر ملک میں پناہ لینا اور وہاں کی شہریت لینا چاہتا ہے۔“

سابق امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل مرحوم نے مجمع الفقیہ الاسلامی جدہ کے توجہ دلانے پر اس موضوع پر ایک مبسوط رسالہ لکھا تھا جس کے آخر میں اس کی تلخیص کرتے ہوئے لکھا کہ بلاد کفر کی شہریت کا حلف اٹھانے والوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اولاً: وہ لوگ جو بلاد کفر کو پسند کرتے ہوں،

وہاں کی شہریت اور رہائش کو مسلم ممالک پر ترجیح دیتے ہوں اور غیر اسلامی قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں تو ان کے کفر اور ارتداد میں کوئی شک نہیں اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہیں، کلمہ پڑھیں، نماز ادا کریں اور بعض اسلامی احکام پر عمل کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”وَمَنْ يَتَوَلَّهمْ فَاِنَّهٗ مِنْہُمْ“ (المائدہ ۵: ۵۱)

”تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔“

اور ”افْتُونُونِ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَ تَکْفُرُونَ بِبَعْضِ فَمَا جَزَاءُ مَنْ یَفْعَلُ

ذٰلَکَ مِنْکُمْ الْاٰخِرٰی فِی الْحِیَۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیْمَةِ یَرْدُونَ اِلٰی اَشَدِّ

العَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ“ (البقرہ ۲: ۸۵)

”حالانکہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا۔ کیا تم کتاب الہی

کے ایک حصے کو مانتے اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو لوگ ایسا کریں،

ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہوں اور مرنے کے

بعد قیامت کے دن انہیں سخت عذاب میں ڈالا جائے۔“

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا حَشَرَ مَعَهُمْ“ (۵)

”جو جس قوم سے محبت کرے گا قیامت کو اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔“

اور یہ بھی فرمایا کہ:

”الْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ“ (۶)

”آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرے۔“

بلا و کفر کی شہریت کے لیے حلف اٹھانے والا دوسرا گروہ وہ ہے جس کے پیش نظر محض دنیوی مفاد ہو جیسے تجارت یا اچھی ملازمت اور دیگر سہولتیں۔ ایسے اشخاص اگر اسلامی احکام پر عمل کو پسند کرتے ہوں، اپنے دین کا فخر یہ ظہار کریں، حتیٰ الوسع غیر مسلم عدالتوں سے رجوع نہ کریں اور اگر ان عدالتوں کا فیصلہ خلاف اسلام ہو تو اسے قبول نہ کریں تو ایسے لوگوں کا ایمان اگرچہ خطرے میں ہے اور وہ ایک عظیم منکر کا ارتکاب کر رہے ہیں لیکن میں ان پر کفر و ارتداد کا حکم لگانے میں توقف کروں گا گو اہل کفر سے ان کی محبت اور ان کے ساتھ معاشرت پر راضی ہونا انہیں اللہ تعالیٰ کی اس وعید کا مستحق بنا دیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

”قل ان كان آباؤكم و ابناؤكم و اخوانكم و ازواجكم و عشيرتكم و اموال اقترفتموها و تجارة تخشون كسادها و مسكن ترضونها احب اليكم من الله و رسوله و جهاد في سبيله فتربصوا حتى ياتي الله بامرہ و الله لا يهدي القوم الفاسقين“ (التوبہ ۹: ۲۴)

”اے نبی ﷺ! آپ ﷺ مسلمانوں سے کہہ دیں کہ اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا، تمہارا وہ کاروبار جس کے بند ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور تمہارے رہنے کے گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو، یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

اور فرمان الہی ہے کہ:

”لا تجدو قوما يؤمنون بالله و اليوم الآخر يوادون من حاد الله و رسوله ولو كانوا ابناءهم او ابناؤهم او اخوانهم او عشيرتهم“ (المجادلہ: ۲۲)۔

”تم ان لوگوں کو جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں کبھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالفوں سے دوستی کی پیچگیں بڑھاتے نہ دیکھو گے اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان والے ہی کیوں نہ ہوں۔“

تیسرے درجے میں وہ اشخاص ہیں جنہیں مجبوراً بلاد کفر میں رہنا پڑا ہو، اس حالت میں کہ وہ ان سے نفرت کرتے ہوں اور اس کا اظہار کرتے ہوں۔ اپنے دین کو سچا اور ان کے دین کو باطل قرار دیتے ہوں۔ ایسے لوگ بلاشبہ بلاد کفر کی شہریت لینے اور وہاں رہنے کی بناء پر گنہگار ہیں اور ان کا اور ان کی اولاد کا ایمان خطرے میں ہے، لیکن انہیں بہر حال کافر و مرتد نہیں کہا جائے گا۔

تاہم جو لوگ نہ شہریت لیں اور نہ اس کے لیے کوشش کریں، اپنے دین کی حقانیت کا اعلان و اظہار کریں، اس پر عمل کریں اور کفار کے دین کو باطل کہیں اور انہیں قبول اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ یہ کر سکیں تو وہاں رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر وہ یہ نہ کر سکیں تو ان پر وہاں سے ہجرت فرض ہے اور ان کے وہاں رہنے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔

ہم امام ابن السبیل کے فتویٰ کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بلاشبہ کفار کے ساتھ معاشرت مردود ہے اور ایسی شہریت قبول کرنا بھی جس میں کفار کے ایسے قوانین کی متابعت کرنا پڑے جو صریحاً خلاف شریعت ہوں البتہ اس اصول کو قبول کرنے کے بعد کسی انفرادی اضطراب اور استثناء کے بارے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ اس طرح کا استثناء کسی عذر رنگ کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ بہت سے مسلمان خصوصاً پاکستانی سیاسی مظلوم بن کر یا قادیانی یا شیعہ بن کر یا طالب علموں کا روپ دھار کر یا وہاں شادی کا ڈھونگ رچا کر مغربی ممالک کی شہریت لیتے ہیں اور اصل مقصد صرف وہاں زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا، سہولتوں سے فائدہ اٹھانا اور دنیا بنانا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان مقاصد کے لیے دین و شریعت کے واضح اصولوں کی مخالفت کی اجازت کوئی عالم دین بھی نہیں دے سکتا۔

لہذا ہماری رائے میں:

۱۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بلاد کفار کی شہریت قبول کرے اور غیر اللہ کی حاکمیت، غیر اسلامی آئین و قوانین کے اتباع اور بلاد کفار کی حفاظت کے لیے جان لڑانے کا حلف اٹھائے یا صرف دولت دنیا کی خاطر دارالاسلام کی شہریت عمداً ترک کر دے؛ اور

۲۔ کسی مسلمان ملک کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو اپنی شہریت کے ساتھ بلاد کفار کی شہریت قبول کرنے کی بھی اجازت دے۔

لہذا حکومت پاکستان کو چاہیے کہ اس نے جن بلاد کفار کے ساتھ دوہری شہریت کے معاہدے کر رکھے ہیں انہیں منسوخ کرے اور دوہری شہریت کے حامل افراد کو ایک متعین تاریخ کے اندر بلاد کفار کی شہریت ترک کرنے کا حکم دے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے نہ انہیں بلاد کفار کی شہریت یعنی چاہیے اور نہ ان کی شہریت کا حلف اٹھانا چاہیے۔ البتہ شریعت جن شرائط کے ساتھ بلاد کفار میں رہنے کی اجازت دیتی ہے، ان کے مطابق وہ وہاں رہ سکتے ہیں۔ مشہور اسلامی دانشور اور مصنف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی مثال ہمارے سامنے ہے جو ساری عمر فرانس میں رہے لیکن انہوں نے وہاں کی شہریت نہیں لی۔

آخری بات یہ کہ ہم اس رائے میں منفرد نہیں ہیں۔ عالم اسلام کے متعدد علماء اس سے پہلے یہی رائے دے چکے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اوپر گزر چکا نیز سعودی عرب کے مرکزی دارالافتاء نے شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی سربراہی میں بلاد کفار کی شہریت اور حلف کے خلاف فتویٰ دیا ہے (۷)۔

تیونس کے الشیخ محمد الشاذلی الفیر نے جو رابطہ عالم اسلامی کے مجمع الفقہی الاسلامی جدہ کے رکن بھی ہیں اور (۸) مفتی دیار یمن شیخ مقبل بن ہادی الوداعی (۹) اور کراچی کی جامعہ حنیفیہ کے شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر فقیر حسین مجازی (۱۰) بھی بلاد کفار کی دوہری شہریت کے خلاف فتویٰ دے چکے ہیں۔

حواشی

- ۱- مولانا محمد دریس کاندھلوی، عقائد اسلام، ص ۲۳۸
- ۲- اگرچہ مسلم ممالک اپنی کمزوری کی وجہ سے انہیں دارالحرب قرار نہیں دیتے۔
- ۳- شرح بلوغ المرام، کتاب الجہاد، شریطا
- ۴- مسند احمد بن حنبل، ج ۶، ص ۱۴۵، ۱۶۰
- ۵- صحیح بخاری، ادب ۹۶
- ۶- فتاویٰ العلماء الاکابر فی حکم التجنس بجنسۃ الکفار الاصاغر، ص ۳۶۰
- ۷- فتویٰ رقم ۲۳۹۳ برئاسۃ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز
- ۸- الشیخ محمد بن عبداللہ بن السبیل، التجنس بجنسۃ دولة غیر اسلامیہ بواسطہ انٹرنیٹ
- ۹- <http://www.ajurry.com/vb/showthread.php?t=9009>
- ۱۰- ماہنامہ چراغ اسلام گوجرانوالہ، جنوری ۲۰۱۳ء، ص ۳۲-۴۷

مادی ترقی کا لازمی نتیجہ - شناخت کا بحران واہمہ یا حقیقت؟

یہ زمانہ انسانی فکر اور معاشرے کی ہر سطح پر مغربی افکار اور تہذیب کے غلبے کا زمانہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب اپنی ابتدا سے اب تک خالص مادیت کی علم بردار رہی ہے۔ مادی ترقی [material progress] ہی کے باعث مغرب آج پوری دنیا پر عملاً متصرف ہے۔ ماریہ سبرٹ لکھتی ہیں:

It was progress which had permitted Europeans to 'Discover' the whole world, and progress which would explain their growing hegemony over the global horizon.^۱

اس حقیقت کے بالمقابل یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مسلمان مادی ترقی میں بہت پیچھے ہیں۔ مغرب کی مادی ترقی اور فتوحات کا عروج، امت مسلمہ پر مغرب کے تسلط اور یلغار کی مسلسل اور متواتر سرگرمیاں اور مسلمانوں کی استخلاف فی الارض سے محرومی نے مسلم دنیا کو عجیب و غریب صورت حال سے دوچار کر رکھا ہے۔ مسلمان اس وقت بیک وقت چار ادوار میں ایک ساتھ زندہ ہیں:

[۱] مسلمانوں کا دینی و مذہبی پس منظر تقریباً ۱۵۰۰ سال قدیم ہے۔

[۲] مسلمانوں کا معاشرتی ڈھانچہ کم و بیش سترھویں اٹھارویں صدی کا ہے۔

[۳] مسلمان عملاً بیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔

[۴] مسلمانوں کی معلومات اکیسویں صدی کی ہیں۔

اس صورت حال نے مسلم دنیا کو عجیب محضے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہ حیثیت قوم مسلمان ایک شکست خوردہ دنیا کے باسی ہیں جو اپنی سمت اور مقام کے تعین میں سرگرداں ہو۔ گزشتہ ڈیڑھ صدیوں میں امت مسلمہ کے علمی نمائندوں نے زوال امت کے تعین کی جستجو میں جو تحریری سرمایہ جمع کیا ہے، اسے پڑھ کر بہ طور امت مسلمہ شناخت کا سوال پوری شدت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ کیا واقعی مسلمان اپنی شناخت کا غالب حصہ کھو چکے ہیں؟ اور باقی ماندہ مسلسل کھو رہے ہیں؟ زوال امت کے اسباب اور تجزیوں کا غالب حصہ آپس میں متضاد اور متضادم معلوم ہوتا ہے۔ اور اس پوری بحث کے تفصیلی مطالعے کے بعد سوائے الجھاؤ کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

زوال سے دوبارہ کمال کی بازیافت کے لیے حکمت عملی اور لائحہ عمل کے حوالے سے مسلم اہل فکر و قلم بالعموم تین نقاط نظر کے حامی معلوم ہوتے ہیں:

مادی ترقی اصل الاصول اور مذہب چند کلیات کا نام ہے: مفکرین کا پہلا طبقہ

پہلا طبقہ قلیل افراد کے ایسے گروہ پر مشتمل ہے جس کے نزدیک مادی ترقی [material progress] کا حصول اصل الاصول ہے۔ غالب تعقل [dominant discourse] کے ساتھ چلنا ہی حقیقی دانش مندی ہے۔ مذہب اگر انسانوں کے لیے آیا ہے تو اس کے قابل قبول ہونے کی شرط لازم یہ ہے کہ وہ زمانے کے کسوٹی پر کسے جانے کے بعد اس سے کھرا نکل آئے۔ بہ صورت دیگر مذہب اکیسویں صدی میں رہنے والے معراج ارتقا پر فائز عقلیت اور تجربیت پسند انسانوں کے لیے اپنے اندر کشش کا کوئی سامان نہیں رکھتا۔ دنیا میں کامل انہماک، تجتمع فی الارض اور تسخیر کائنات ہی فی الحقیقت دانش مندی اور فطرت کا تقاضا ہے۔ مذہب چند اصولی ہدایات اور کلیات کا نام ہے۔ اس کا تعلق انسان کی ذاتی اور انفرادی زندگی سے ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی اور معاشرتی معاملات کے ہر پہلو میں مذہب کی ”دراندازی“ ہرگز قابل قبول نہیں۔ عہد جدید میں معاشرے مذہب کی بنیاد پر تعمیر و تشکیل نہیں پاتے بلکہ ترقی، ارتقا، معیار زندگی، سہولت، آسائش، طاقت، اقتدار اور سرمائے کی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں۔ اور ان ہی اصولوں پر جانچے اور پرکھے جاتے ہیں۔ اگر اس مسئلہ حقیقت کے باوجود بھی انسانی معاشرے کا کوئی طبقہ مذہب سے اپنا تعلق استوار اور قائم رکھنے پر مصر ہو تو اسے چاہیے کہ جرمن اور فرنگ قومیتوں کی طرح مسلم قومیت کی وحدت کو اپنے ساتھ ملحق رکھ کر مادی ترقی کے کسی بھی سیاسی، سماجی، عمرانی، معاشی یا قانونی ماڈل کو اختیار کر لے۔

اگر مادی ترقی کی راہ میں اسلامی علمیات [Islamic Epistemology] اور مابعد الطبیعیات [Metaphysics] میں تبدیلی، ترمیم یا متنبخ کرنی پڑے تو اسے بے خوف و خطر قبول کر لینا چاہیے۔ عزت اور ذلت کا فیصلہ کن اور حتمی معیار ”مادی ترقی“ ہے۔

یہ طبقہ مغربی افکار و تہذیب اور فکر و فلسفے کو ایک عالم گیر سچائی اور فطری حقیقت کے طور پر قبول کرتا ہے۔ مذہب اور دینی اخلاقیات اس طبقے کی نظر میں ازکار رفتہ باتیں ہیں، اور ذہن انسانی کی عدم بلوغت [immaturity] کی یادگار ہیں۔

اس طبقے سے وابستہ مفکرین بالعموم ادب، فلسفہ، عمرانیات اور معاشیات کے شعبوں سے وابستہ ہوتے ہیں، اس طبقے کے وہ افراد جو برعظیم سے وابستہ ہیں، ان کی اکثریت اسلامی علوم اور دینی مصادر علمی تک بہ راہ راست رسائی نہیں رکھتے۔ اسلامی فکر سے متعلق ان کے خیالات کا بنیادی حوالہ مستشرقین ہی کی کتابیں ہیں۔ اس وقت اسلامی دنیا میں مغرب کے زیر اثر ”بنیاد پرستی“ کے خلاف جنگ میں اس طبقے سے وابستہ افراد کی خدمات وسیع پیمانے پر حاصل کی جا رہی ہیں۔ عصری تعلیمی اداروں میں

”روشن خیالی“ کی ترویج کے لیے ایسے افراد کی افواش مسلسل کی جا رہی ہے تاکہ اسلامی دنیا میں لادینیت [Secularism] کو فروغ حاصل ہو سکے۔

اسلام کے دفاع اور ترویج کے لیے ترقی ایک ناگزیر ضرورت: مسلم مفکرین کا دوسرا طبقہ دوسرا طبقہ مخلص مسلم مفکرین کے ایسے گروہ پر مشتمل ہے جن کے نزدیک اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی غیر مشروط اور اٹوٹ ہے۔ مسلمانوں کی کامیابی اور ناکامی کا واحد پیمانہ اسلام ہے۔ اسلام کو ماننے اور اس پر عمل کا تقاضا اسلام کی ترویج، اشاعت اور اس کے عملی نفاذ سے عبارت ہے۔ امت مسلمہ کے دینی اور معاشرتی تشخص کو قائم رکھنے، اسلام کو ریاستی سطح پر نافذ کرنے اور عسکری سطح پر مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے مادی ترقی [material progress] کا حصول ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ بالفاظ دیگر اسلام اصل ہے اور ترقی اس اصل کو مضبوط، محفوظ اور مستحکم کر دینے کی ”شاہ کلید“ ہے۔

مغربی فکر و تہذیب کے بے شمار پہلو مثلاً سیکولرزم، قوم پرستی، اباحت پرستی، اخلاقی بے اعتدالی، جنسی بے راہ روی وغیرہ صریحاً مسترد کر دینے کے قابل ہیں۔ اس کڑی تنقید کے باوجود مادی ترقی کا ”فصل الجذ“ بہ ہر حال مغرب ہی کے پاس ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مغرب کے بے شمار پہلو لائق رد بھی، لیکن اس کے بہت سے اجزاء سے استفادہ خود اسلام کے دفاع و ترویج اور ملت اسلامیہ کے تہذیبی تشخص کی ناگزیر مجبوری ہے۔ مغربی تجربات اور اکتشافات خصوصاً سائنسی علوم و فنون اور سائنسی منہاج کا اخذ و کسب بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں تعلیم و تحصیل ہی وہ راہ ہے جس پر چل کر مطلوب و مقصود میں کامیابی کا امکان ہے۔ مغرب سے علوم و فنون سے اکتساب اور استفادے کے وقت نہایت حزم اور احتیاط اور چھان پھٹک کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں خد ما صفا و دع ما کدر کا اصول پیش نظر رہنا چاہیے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اسلامی مابعد الطبیعیات، علمیات اور اخلاقیات کے حصار میں ان علوم و فنون کی تحصیل کریں۔ اس طرح ان مغربی علوم و فنون کی تحصیل کے نتائج اور اثرات ہرگز وہ نہ ہوں گے جن کا اظہار مغرب سے ہوا ہے۔ ایک بار جب ان علوم و فنون کی تکمیل و تحصیل ہو جائے گی تو اس وقت مسلم سائنس دانوں کو چاہیے کہ وہ مغرب کے فلسفیانہ نظریات سے دامن جھاڑ کر اسلامی مابعد الطبیعیات، علمیات اور اقدار کے زیر اثر ایسے نتائج پیدا کریں جو مغرب سے الگ ہوں۔

مادی ترقی اور سائنسی علوم و فنون اصلاً غیر اقداری [value neutral] ہیں۔ بالفاظ دیگر سائنسی علوم اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی ترقی فی نفسہ کوئی اچھائی یا برائی نہیں رکھتی، بلکہ اس کے استعمال کا مقصد اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔

مخلص مفکرین کا یہ گروہ اسلامی علمیات پر تو گہری نظر رکھتا ہے، لیکن مغربی فکر و فلسفے پر، الا ماشاء اللہ، تجزیاتی اور تنقیدی نظر نہیں رکھتا۔

دین اور مادی ترقی دو الگ مابعد الطبعی دائروں کے رہیں: مفکرین کا تیسرا طبقہ تیسرا طبقہ مخلص مسلم مفکرین کے ایسے گروہ پر مشتمل ہے جو اسلامی علوم اور مغربی فکر و تہذیب کی اصلیت اور حقیقت کو اس کے بنیادی ماخذ اور سیاق و سباق کے ساتھ نہ صرف جانتا ہے، بلکہ اسلامی علوم کی روشنی میں اس کے محاکے کی بھی اہلیت رکھتا ہے۔ ان کے مطابق مغربی طرز کی مادی ترقی کے حصول کے لیے صرف مغربی زبان اور سائنسی علوم و فنون کی تحصیل و تعلیم کافی نہیں ہے۔ زبان تو علوم کے ابلاغ، اظہار اور تفہیم کا محض ایک ذریعہ [medium] ہے۔ وہ فکری سرمایہ اور خرد افزائی امر دیگر ہے جو مادی ترقی کا لازمہ ہے۔

ترقی پذیر اقوام آج وہیں کھڑی ہیں، جہاں مغرب اب سے ۳۰۰ سال پہلے کھڑا تھا۔ ترقی کے حصول کے سفر میں ترقی پذیر اقوام کو بھی عملاً ان تمام راستوں اور مراحل سے گزرنا ہوگا، جن سے غیر ترقی یافتہ مغرب گزر کر ترقی یافتہ ہوا ہے۔

انسان مرکز کائنات: مادی ترقی کے حصول کا پہلا ہدف

اس سفر کا پہلا ہدف انسان اور کائنات کا رُخ ”خدا مرکزی“ سے ”بشر مرکزی“ [Humanism] کی طرف پھیر دینا ہے۔ ترقی کا حصول اور جدیدیت کی تشکیل جن فکری عناصر کی مرہون کرم ہے ان میں کلیدی عنصر ”بشر مرکزی“ [Humanism] ہے۔ چارلس سنگر کے مطابق جدید فکر [modern thought]، جدید سائنس [modern science]، جدید آرٹ [modern art] اور جدید ادب [modern letters] سب ”بشر مرکزی“ کی پیداوار ہیں۔^۲

مغرب پر نظر رکھنے والا ہر طالب العلم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ سولہویں صدی سے یورپ میں لادینیت کے نشرو فروغ نے یورپ بلکہ پورے مغربی ذہن میں یہ بات راسخ کر دی کہ معاشی عروج اور تہذیبی برتری کی واحد راہ مذہبی بندشوں اور تحدیدات سے آزادی اختیار کر لینے میں ہی پنہاں ہے۔ اس لیے ترقی کا مغربی ماڈل اسلام کے ساتھ غیر مشروط وابستگی اور عملی و محسوس تعلق کے ساتھ ممکن نہیں۔ جہاں توحید ہی مقدمہ ہے اور توحید ہی نتیجہ ہے۔ ماریہ برٹ لکھتی ہیں:

Progress is more than just a journey or an ideal. It is modern destiny. To modern man, and those who want to share his identity, rejecting faith in progress is unbearable. Modern man is defined by progress. His self-esteem is rooted in it and it is his deepest justification for the ruthlessness he displays towards his fellow men and nature.^۳

آزاد منڈی کی معیشت ترقی کا اصلی میدان

دوسری بات یہ کہ اسلامی مابعد الطبیعیات کے زیر اثر مادی ترقی اس لیے بھی ممکن نہیں کہ حصول

ترقی کا سب سے سربلج العمل اور زرخیز میدان مارکیٹ [market] ہے۔ مارکیٹ میں صرف ایک ہی اصول کارفرما ہوتا ہے: زر سے زر کا حصول اور سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری [accumulation of capital for the sake of accumulation]۔ جب بھی ترقی کے مارکیٹ ماڈل پر خارج سے کوئی نظریہ [ideology] مسلط [impose] کیا جائے گا، شرح ترقی گر جائے گی اور آزاد منڈی کی معیشت [free market economy] کے ذریعے حاصل ہونے والی ترقی کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ بالفاظ دیگر ترقی کے عمل میں اگر اسلامی احکام اور فرامین کے تحت حدود و قیود عائد کی جائیں گی [چونکہ اسلام کے ماننے والوں کے لیے ناگزیر ہیں] تو ترقی لازماً محدود ہوگی اور لامحدود ترقی کے آگے کھڑی نہیں رہ سکے گی۔ اور اگر بالفرض اس عمل پر کوئی قدغن عائد نہ کی جائے تو اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی اقدار [values] سرمایہ دارانہ ہوں گی، اسلامی نہیں۔

مادی ترقی مخصوص اقدار اور مستقل تہذیب ہی میں ممکن ہے

تیسرا اہم ترین اور غور طلب پہلو یہ ہے کہ سائنسی ایجادات اور اکتشافات ہرگز غیر اقداری [value neutral] نہیں ہیں۔ جدید اکتشافات کو مغرب کے نظام اقدار سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمام علوم و فنون اور اس کے مظاہر ایک خاص تہذیب و تمدن، اقدار و روایات اور مابعد الطبیعیات میں پیدا ہوئے اور پھلے پھولے ہیں۔ یہ جہاں بھی جائیں گے اپنی اقدار، روایات، اسلوب حیات اور طرز زندگی ساتھ لے جائیں گے۔ ضیاء الدین سردار لکھتے ہیں:

”جدید سائنس واضح طور پر مغربی ہے۔ پوری دنیا میں جہاں بھی سائنس کو اہمیت حاصل ہے وہ اپنے اسلوب اور طریق کار میں مغربی ہے۔ سائنس داں کا رنگ اور اس کی زبان خواہ کچھ بھی ہو“۔

مغربی سائنس اور نیچرل فلاسفی: بنیادی فرق

ممکن ہے بعض طبائع ”مغربی سائنس“ کا لفظ سن کر کچھ وحشت محسوس کریں کہ آیا سائنس بھی مشرقی یا مغربی ہوتی ہے؟ یہ امر واقعہ ہے کہ مغرب کی مادی ترقی [material progress]، جدید سائنس [modern science] کی مہون کرم ہے۔ جدید سائنس قبل از جدید معاشروں میں مروج نیچرل فلاسفی سے اپنی ماہیت اور غایت دونوں میں مختلف بلکہ متضاد ہے۔ قبل از جدید معاشروں کی سائنسی سرگرمی فطرت اور اس کے تقدس کو قائم رکھتے ہوئے اس کے پس پشت کارفرما اسرار کو جاننے سے عبارت تھی۔ اس کا مقصد کائنات اور فطرت کی سچائی، رعنائی، حسن اور شان کو عیاں کرنا تھا۔ جدید سائنس کی ترقی ایک خاص مابعد الطبیعیات کے زیر اثر ممکن ہو سکی ہے۔ اس کا مقصد اور محرک کائنات اور فطرت پر ارادہ انسانی کا تسلط ہے اور اس کا استحصال کی حد تک استعمال ہے۔ ہائیڈرک کے افکار اس طرف بڑا واضح اشارہ

کرتے ہیں، اس کے مطابق:

The essence of technology, which he names "the enframing," reduces the being of entities to a calculative order. Hence, the mountain is not a mountain but a standing supply of coal, the Rhine is not the Rhine but an engine for hydro-electric energy, and humans are not humans but reserves of manpower. The experience of the modern world, then, is the experience of being's withdrawal in face of the enframing and its sway over beings.^۵

قبل از جدید معاشروں میں فطرت اپنے اندر ایک شان تقدیس رکھتی تھی اور جدید معاشروں میں فطرت محض ایک ”شے“ [commodity] ہے۔ تسخیر کائنات اس کے مقاصد میں شامل نہیں بلکہ کائنات کا استحصال کی حد تک استعمال دنیائے جدید کا عزم ہے۔ مادی ترقی کے حصول کے پس پشت کار فرما دہ بدترین قسم کی سفاکی کی مظہر ہے، مارکوزے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

We submit to the peaceful production of the means of destruction, to the perfection of the waste, to being educated for a defense which deforms the defenders and that which they defend.^۶

ٹیکنالوجی، جو جدید سائنسی ترقی اور تعیشت کا سب سے فعال مظہر ہے، کی حقیقت کے

متعلق فیاض الدین سردار لکھتے ہیں:

Technology is like fire. As long as it is under your control, you can derive benefit from it. Let it get out of hand, and you will be the first one it will destroy. And then the trees, and then the wood. And finally the earth itself.^۷

اس لیے جدید سائنس کو غیر اقداری [value neutral] ان معنوں میں سمجھنا کہ اس کے ثمرات کو جس ظرف میں ڈال دیا جائے گا وہ اسی کی شکل اختیار کر لے گا اور ہم ان ثمرات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے اثرات سے متاثر نہیں ہوں گے، نادانی ہے۔ حسین نصر فرماتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی اپنے ساتھ ایک خاص تصور کائنات، ایک خاص طرز

زیست، ایک خاص طرز عمل اور ایک خاص تصور وقت بھی لاتی ہے..... میں سوچ نہیں سکتا

کہ اسلامی تہذیب مغربی ٹیکنالوجی کا ایک اچھا حصہ اختیار کرے اور کہے کہ یہ اچھا اور کار

آمد ہے اور دوسرا حصہ مسترد کر دے اور کہے کہ یہ برا اور بے کار ہے۔ آپ جدید ٹیکنالوجی کا

جو بھی حصہ اختیار کریں وہ اپنے ساتھ منفی اثرات بھی لائے گا۔“^۸

مزید کہتے ہیں:

”مجھے ایسے حضرات سے سخت اختلاف ہے جو کہتے ہیں یورپ جاؤ وہاں بندوبست بنانا سیکھو، واپس آؤ۔ بندوبست بردار فوجیں کھڑی کرو اور باقی ہر چیز بھول جاؤ۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ دراصل تمام چیزیں اکٹھی آتی ہیں۔ بندوبست سازی سے لے کر کمپیوٹر اور سیل فون بنانے کی ٹیکنالوجی تک فولاد سازی، جہاز سازی یہ سب صنعتیں آتی ہیں۔ کیوں کہ ان سب کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ ٹیکنالوجی اپنا ایک تصور کائنات رکھتی ہے اور انسان پر عائد کرتی ہے“۔^۹

ترقی کے فعلی محرکات اور دین کا اقداری نظام

اسلامی مابعد الطبیعیات کے زیر اثر پروان چڑھنے والی مادی ترقی مغرب کے لیے کوئی خطرہ [threat] بن سکے گی یا نہیں۔ یہ سوال تو رہا ایک طرف لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ یہ ترقی مسلمانوں کی اسلام کے ساتھ وابستگی میں ایک بڑا رخنہ ضرور ڈال دے گی۔

مادی ترقی [material progress] کے تمام تر فعلی محرکات ہوس [lust]، لالچ [greed] اور خود غرضی [self-interestedness] سے عبارت ہیں، جو مذاہب خصوصاً اسلام کی بنیادی تعلیمات صبر و شکر، فقر و توکل، غنا و عطا سے بہراہ راست متضاد ہیں۔ اس لیے ان میں جبر و مقابلہ ناگزیر ہے۔ ماریہ سہرٹ لکھتی ہیں:

Leniency bordering on approval towards such a sin, which is now perceived as the vertiable psychological engine of material progress.^{۱۰}

مزید لکھتی ہیں:

Greed and arrogance in individual turn into prosperity and justice for nations and all mankind an invisible hand, a cunning reason that will do him humanity good even its members indulge in evil.^{۱۱}

ان وجوہات کی بنا پر تیسرے طبقے کے مطابق مغربی ترقی کے حصول کی کوشش اور اسلام کے ساتھ وابستگی بہ یک وقت ممکن نہیں۔ (جاری ہے)

حواشی

- 1- José Maria Sbert, "Progress" in *The Development Dictionary: A Guide to Knowledge as Power*, [ed., Wolfgang Sachs], London & New Jersey: Zed Book Ltd., 1993, p. 197.
- 2- Charles Singer, *A Short History of Science: to the Nineteenth Century*, Oxford: Clarendon Press, 1941, p. 167.
- 3- José Maria Sbert, op.cit., 195.
- 4- Ziauddin Sardar, *Explorations in Islamic Science*, London: Mansell Pub., 1989, p. 6.
- 5- *Stanford Encyclopedia of Philosophy Online*, s.v. "Postmodernism", accessed Feb, 4, 2014.
<http://plato.stanford.edu/entries/postmodernism/>
- 6- Herbert Marcuse, *One-Dimensional Man*, London & New York: Routledge, 1964, p. xxxix.
- 7- Ziauddin Sardar, *Science, Technology and the Development in the Muslim World*, London: Croom Helm, 1977, p. 128.
- ۸- حسین نصر / مظفر اقبال، ”اسلام، سائنس اور مسلمان“، مضمونہ اقبالیات، جنوری-مارچ، ۲۰۰۷ء، صفحہ ۱۰۔
- ۹- ایضاً، صفحہ ۱۲۔
- 10- José Maria Sbert, op.cit., p. 196.
- 11- Ibid.

جماعت اسلامی اور انتخابی سیاست الیکشن ۲۰۱۳ء میں جماعت کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ

مرتب پروفیسر طارق بٹ

مرتب نے کتاب کے مقدمہ میں کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ

سیاسی جماعتیں انتخابات میں کبھی جیت جاتی ہیں اور کبھی ہار جاتی ہیں اور یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں لیکن پاکستان میں جتنے بھی ایسے انتخابات ہوئے ہیں جن میں جماعت اسلامی نے حصہ لیا ہے وہ ان میں ہمیشہ ہاری ہے لہذا انتخابات ۲۰۱۳ء میں جماعت اسلامی کی شکست کوئی معمول کا واقعہ نہیں بلکہ جماعت کے حمایتیوں کو اس کی شکست سے غیر معمولی صدمہ پہنچا ہے۔ جماعت کی قیادت نے خود تو اس شکست کے اسباب کا جائزہ لینے یا مستقبل میں اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنے کا کوئی عندیہ (پلک میں) نہیں دیا لیکن جماعت کی حمایت کرنے والے اور اس کی فکر سے ہمدردی رکھنے والے کئی دانشوروں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

اگرچہ جماعت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ اس کی پالیسیوں پر کھلے عام بحث کی جائے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ جماعت کا فائدہ اس میں ہے کہ اس کی شکست کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے اور مستقبل کے لیے ایسی تجاویز پیش کی جائیں جن پر عمل کر کے جماعت کی کامیابی کی راہ روشن ہو سکے۔

اس کتاب میں ہم نے اس موضوع پر سوچنے اور خامہ فرسائی کرنے والے دانشوروں کے مضامین جمع کر دیے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ جماعت کے سوچنے سمجھنے والے عناصر اس مجموعے سے استفادہ کریں گے۔ اللہ کرے جماعت کی قیادت بھی اس سے فائدہ اٹھائے اور اپنے ہمدردوں اور حمایتیوں کی تجاویز پر غور کر کے مستقبل میں ایک ایسا موثر لائحہ عمل تشکیل دے سکے جو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچا سکے۔

ان مضامین میں سے اکثر کے لکھنے والے جماعت کے حلقے کے آدمی ہیں اور جماعت سے ان کی خیر خواہی اور محبت معروف ہے۔ سب کا لب و لہجہ شائستہ، مدلل اور متین ہے لہذا توقع ہے کہ جماعت کی قیادت ان مضامین میں کبھی گئی باتوں پر غور کرے گی اور جن چیزوں کو مناسب سمجھے گی ان پر عمل کرنے سے نہیں ہچکچائے گی۔

مقالہ نگاروں میں سے غالب اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جماعت اسلامی کو اپنی فکر اور لائحہ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اگرچہ بعض دانشوروں نے جماعت کی سیاسی حکمت عملی اور کارکردگی پر بھی بحث کی ہے اور اس کے لیے تجاویز بھی دی ہیں لیکن اکثر اصحاب کی رائے یہ ہے کہ جماعت کو تعمیر فرد اور اصلاح معاشرہ کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جماعت اپنی پالیسیوں کے جمود اور عدم احتساب کی وجہ سے زوال پذیر ہے اور اگر اس نے اپنی اصلاح نہ کی اور اپنی پالیسیوں کو تبدیل نہ کیا تو اس کے زوال کو روکنا ممکن نہ ہوگا۔

۲۰۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۳۲۵ روپے ہے جو کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کتاب پورب اکیڈمی اسلام آباد (فون 051-231 7092 ای میل poorab_academy@yahoo.com) نے طبع کی ہے اور مندرجہ ذیل جگہوں سے مل سکتی ہے: لاہور: کتاب سرائے، بک ہوم، کراچی: سعید بک بنک، راولپنڈی: رائل بک ایجنسی، ملتان: یکین بکس۔

چند صحیح طلب مفہومات

مولف: محمد قطب اردو استفادہ: حامد کمال الدین

مولف کا خیال ہے کہ دین سے دوری ہی مسلمانوں کا اہم مسئلہ نہیں بلکہ دین کے بنیادی تصورات کا سوئے فہم بھی ایک بڑا اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس سوء فہم کے مختلف اسباب میں سے غیر اسلامی افکار خصوصاً مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور اسے منبع ترقی و خوشحالی سمجھ کر اس کی تقلید اعمیٰ بھی ہے۔ مصنف نے پانچ بنیادی اسلامی تصورات یعنی توحید (لا الہ الا اللہ)، عبادت، تقدیر (قضا و قدر) دنیا و آخرت اور تہذیب و تعمیر ارض پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس ضمن میں صحیح عقیدے کو متحج کرتے ہوئے غلطی ہائے مضامین کی نشان دہی کی کوشش کی ہے۔

۴۰۰ صفحات کی اس کتاب پر قیمت درج نہیں اور یہ کتاب سرائے، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور اور مطبوعات ایقظا، پوسٹ بکس ۱۰۲۶۲ لاہور (فون 0323-403 1624) سے طلب کی جاسکتی ہے۔

تذکار بگویہ

تالیف: صاحبزادہ انوار احمد بگوی

یہ تذکار بگویہ کی جلد سوم ہے جو ۱۸۸۳ء سے ۲۰۱۰ء تک متحدہ پنجاب کے ایک عظیم علمی اور روحانی خاندان کے علماء کرام اور مشائخ عظام کے خطوط، حالات اور خدمات کے تذکرے و تاریخ پر مشتمل ہے۔ فاضل مولف کے الفاظ میں اس جلد میں شامل ہیں:

☆ خانوادہ ولی اللہی سے فیض یافتہ علماء اور مشائخ بگویہ کے نام بر صغیر کے مشاہیر علماء، مبلغین، اساتذہ اور مشائخ کے خطوط و مراسلات

☆ اسلام کی حفاظت، خدمت و تبلیغ دین اور اشاعت، علم کے لیے کی گئی محنتوں کا احاطہ

☆ اہم اشخاص کے بارے میں توضیحی نوٹ اور تاریخی واقعات کا پس منظر

☆ مکتوب نگاروں کے مختصر اور مصدقہ سوانحی خاکے اور حزب الانصار کے ساتھ تعلق خاطر

☆ تحریک خلافت اور تحریک مولات کے گمشدہ اوراق اور بے نام جانثاروں کا تذکرہ

☆ ضلع سرگودھا میں تحریک خلافت کی سرگرمیاں اور عدم تعاون کے لیے جید علماء کا متفقہ فتویٰ

☆ پنجاب میں محدث بگوی برادران علم الحدیث کے اولین استاد اور ناشر حدیث کی حیثیت سے

☆ بعض دلچسپ اور نادار نگارشات کے سکین شدہ عکس اور جہان معنی

☆ ایک منفرد مجموعہ ☆ ایک دلچسپ مطالعہ ☆ ایک تابناک تذکرہ

بلاشبہ یہ تذکار ایک تاریخی دستاویز ہے اور اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اپنے بزرگوں کی خدمات کا تذکرہ جب وہ دینی اور علمی نوعیت کی ہوں بلاشبہ قابل فخر و اعزاز ہے تاہم اگر فاضل مولف اس عظیم الشان ماضی کے ساتھ اگر اپنے ادارے کے حال اور مستقبل کے منصوبوں کا بھی کچھ ذکر کر دیتے تو یہ مزید خرد افروزی کا سبب ہوتا۔

۸۸۰ صفحات کی یہ کتاب مکتبہ مجلس حزب الانصار، جامع مسجد بگویہ بھیرہ (ضلع سرگودھا) سے

دستیاب ہے۔ قیمت درج نہیں۔

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

- | | |
|---------|---|
| اردو | ۱۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل |
| | ۲۔ ہمارا دینی نظام تعلیم |
| | ۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی |
| | ۴۔ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل |
| | ۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش |
| | ۶۔ اسلام اور تزکیہ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ) |
| | ۷۔ حقیقت تزکیہ نفس |
| | ۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال و اخلاق کا حصہ اول) |
| | ۹۔ اسلام اور پاکستان |
| | ۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی |
| | ۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون |
| | ۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں) |
| | ۱۳۔ مطالعہ قرآن وحدیث (برائے جماعت اول تا پنجم) |
| بروشرز | ۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام |
| | ۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟ |
| | ۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات |
| | ۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام |
| | ۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ |
| | ۱۹۔ حقیقت تصوف |
| انگریزی | ۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols) |
| | ۲۱۔ Noble Quran, Part 1 |
| | ۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan |
| عربی | ۲۳۔ السلطة التشريعية - دراسة مقارنة |

